ہدیہ (یادگار) بہ عالیجناب مولانا ابوالکلام صاحب آزاد مدظلہ العالی

اسلامی کشکول

قاضی مظہر الدین احمد بلگرامی

استاد شعبہ دینیات مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ

ناشر

کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی ۶

فہرست مضامین

طبع اوّل — اپریل ۱۹۵۷ء

تعداد اشاعت — ایک ہزار

قیمت مجلد علاوہ محصول ڈاک — تین روپے

ملنے کا پتہ

کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد، دہلی ۶

یا

فرینڈس بک ہاؤس، شمشاد بلڈنگ، علی گڑھ

مطبوعہ الجمعیتہ پریس دہلی

پیش لفظ

(از مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

قاضی مظہرالدین احمد صاحب بلگرامی فاضل "الازہر یونیورسٹی" کی کتاب "اسلامی کشکول" کا مسودہ میں نے غور سے پڑھا۔ یہ دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی کہ قاضی صاحب نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی تعلیمات کے مختلف پہلوؤں پر چھوٹی اور بڑی بہت سی مستند کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن اس کے باوجود عرصے سے ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ جس میں اختصار کے ساتھ اسلام کی خاص خاص تعلیمات کو ایسے ڈھنگ میں پیش کیا گیا ہو جس سے وہ شبہات دور ہو جائیں جو جدید تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے اسلام پر کیے جاتے ہیں، اور عام پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہوں۔ قاضی صاحب نے اسلامی تعلیمات کو بڑے دلکش اور موثر انداز میں سمجھا کر اس کتاب کی افادیت میں چار چاند لگا دیئے ہیں اور بڑے سلیقے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانیت کی تعمیر میں اسلام نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

میرے خیال میں یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں کیا جائے، تاکہ دوسرے مذاہب کے لوگ بھی یہ سمجھ سکیں کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے، اور آج بھی ترقی کے اس دور میں جبکہ انسانیت کے سوا ہر چیز ترقی کر رہی ہے، اسلام کے اصول کو سامنے رکھ کر بہت سے الجھے ہوئے مسائل کا صحیح اور مناسب حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔

میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ قاضی صاحب کی اس محنت کو قبول فرمائے، ان کو جزائے خیر دے، اور اس کتاب کو عام قبولیت عطا فرما کر لوگوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔

عبداللطیف عفی عنہ   ۲۱ رفروری ۱۹۵۵ء

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی دو سالہ خدمت اور شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی کی آٹھ سالہ چاکری نے یہ بات درجۂ یقین تک پہنچا دی کہ موجودہ نسل کے نوجوانوں کے رجحانات اور اُن کے خیالات کو سامنے رکھ کر اگر اسلامی تعلیمات دل نشین انداز میں سمجھائی جائیں تو بڑی آسانی سے وہ اُن کے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اُتر جاتی ہیں، پڑھانے والے کو جب تک اس کا صحیح اندازہ نہ ہو کہ پڑھنے والوں کے دماغوں میں کس قسم کے خیالات بسے ہوئے ہیں، تو اُس کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ پرانے خیالات جو دماغوں پر چھائے ہوتے ہیں نئے خیالات کو دماغ میں جمنے نہیں دیتے۔ ظاہر ہے کہ سمجھانے اور بتانے والا ایسی حالت میں دینی رجحان پیدا کرنے کے لئے کوئی مؤثر طریقہ اختیار نہیں کر سکتا، اور نتیجہ مایوسی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی طبیب مریضوں کا علاج محض اس لئے کرے کہ اس کا کام ہی علاج کرنا ہے،

انتساب

ہر اس انسان کی طرف جس کا شعار و دین انسانیت کی خدمت ہو

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر
شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(اقبال)

کرنے پر مجبور ہو جائیں، اور اُن سے عقیدت پیدا ہو جائے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ کسی سے مرعوب ہو کر اسلامی تعلیمات کو توڑ مروڑ کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے، اسلام کی تو ہر تعلیم فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے، اگر اس میں ردّ و بدل کیا جائے گا تو قوی امکان ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے مطابق نہ رہے، اور اس کا سمجھنا زیادہ دشوار ہو جائے۔

نہیں معلوم لوگوں نے یہ کیوں سمجھ لیا ہے کہ اسلام مسلمانوں کا دین ہے، اسلام تو انسانوں کا دین بننے کے لئے آیا ہے، اور جو انسان اس کے بنیادی عقائد کو مان لیتا ہے وہ مسلمان کہلانے لگتا ہے۔ اسلام ایسی میراث نہیں ہے کہ جو باپ سے بیٹے کی طرف محض بیٹا ہونے کی وجہ سے منتقل ہو جائے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السّلام سے لے کر خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر اس دنیا میں آئے سب دینِ اسلام پر تھے، اس کو ٹکسالی بنانے کے لئے ہی قرآن مجید میں " دین اللّٰہ " سے تعبیر کیا گیا ہے، اور جب سے انسان نے خدا کی اس زمین پر قدم رکھا ہے اُسی وقت سے اس کی فطری پیاس بجھانے کے لئے خالقِ فطرت نے انسان کے سامنے وہ تعلیمات رکھ دیں کہ جن کو ماننے کے لئے وہ بیتاب نظر آتا تھا، آج غیر اسلامی افکار کے شیدائی اسی لئے مضطرب اور بے چین نظر آرہے ہیں کہ انھوں نے " دینِ انسانیت " کی قدر نہیں کی، اور اُس کی بتائی ہوئی باتوں کو پسِ پشت ڈال دیا۔

خدا کی آخری کتاب قرآن مجید سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام تعلیمات الٰہیہ کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر بسنے والے تمام انسان بہترین اجتماعی زندگی بسر

اُن کے حالات، مرض کی کیفیت، اور ان باتوں سے واقفیت حاصل کرنے کی بالکل کوشش نہ کرے جن کا جاننا نسخہ لکھنے سے پہلے ضروری ہے، تو اس کی توقع نہ رکھنا چاہیئے کہ مریض شفایاب ہو جائیں گے، اور ایسے شخص کو تو طبیب کہنا ہی صحیح نہ ہوگا۔

تجربہ بتا رہا ہے کہ صرف موجودہ نسل کے نوجوان ہی نہیں، بلکہ وہ لوگ بھی کہ جنھوں نے اسلامی تعلیمات سے ٹکرانے والے مغربی افکار کی ایک عرصے تک عقیدتمندانہ پرستش کی ہے، سمجھنے لگے ہیں کہ یہ افکار اُن کے دلوں کو وہ آبِ حیات نہیں بخشتے جس کی اُن کو تلاش ہے، اور جس کے پینے کے بعد انسان انسانیت کا مجسّمہ بن جاتا ہے، اُن میں کا کوئی فرد تو بے چینی اور اضطراب کے عالم میں یہ کہہ رہا ہے۔

پڑھ لئے میں نے علومِ شرق وغرب
رُوح میں باقی ہے اب تک دردوکرب (اقبالؔ)

اور کوئی یہ کہہ رہا ہے۔

چلتا ہوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں (غالبؔ)

لیکن زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ خضرِ راہ بن کر اُن سے کوئی یہ کہنے والا نہیں دکھائی دیتا۔

دست ہر نا اہل بیمارت کُند سُوئے مادر آ کہ تیمارت کُند (رومیؔ)

اس زمانے میں ایسے علمائے اسلام کی بہت زیادہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ جو تعلیم یافتہ طبقے کے سامنے اسلامی افکار کو ایسے انداز میں پیش کر سکیں جو اُن کی سمجھ میں آنے والا ہو، جاذبیت کے ساتھ اس قدر معقول ہو کہ وہ اس کو تسلیم

سمی اس کو ملتا جاتا ہے اس برتن میں ڈالتا جاتا ہے، اس کتاب کے لکھنے سے میری ایک غرض یہ ہے کہ اسلامیات سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو عموماً اور نئی نسلوں کے نوجوانوں کو خصوصاً ایک خاص انداز میں یہ بتلا دیا جائے کہ اسلام ایک مکمل ترین مذہب ہے، اور اس کی تعلیمات پر عمل کر کے انسان دینی و دنیوی زندگی کے انتہائی مدارج بڑی آسانی سے طے کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اسلامیات کے مطالعے کا شوق و ذوق رکھنے والوں کو ان بہت سی کتابوں میں سے جو کہ اسلام اور اسلامیات پر وقتاً فوقتاً لکھی گئی ہیں، چند کتابوں کے ناموں سے واقف کر دیا جائے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ کتابوں کے اقتباسات "اسلامی کشکول" میں درج کر دئے جائیں، اور ان کے ساتھ ساتھ حوالہ بھی دے دیا جائے، تاکہ اصل کتاب کی طرف رجوع کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔ چند عربی کتابوں کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر اردو اور انگریزی کتابوں میں سے عبارتیں یا ان کے ترجمے درج کئے گئے ہیں، یہی وہ بھیک ہے جو ان کتابوں کے مصنّفین اور مؤلّفین سے مجھے ملی ہے، اور ایسی تمام چھوٹی بڑی کتابوں کی تعداد جن سے کہ استفادہ کیا کیا گیا ہے پچاس سے زیادہ ہے۔

کوئی اور کہے یا نہ کہے لیکن میں ضرور یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب میں جس جس موضوع پر خامہ فرسائی کی گئی ہے، سچ تو یہ ہے کہ کسی موضوع کا بھی پورے طور پر حق ادا نہیں کیا جا سکا ہے، اور ادا کیسے کیا جاتا جب کہ ہر موضوع ایک مستقل تالیف چاہتا ہے، البتہ اس تالیف کی وہ اغراض جن کا اوپر ذکر آچکا ہے ایک حد تک ضرور پوری ہو جاتی ہیں۔

کریں، اور ہر ممکن وسیلے سے اس کی آبادکاری میں حصّہ لیں۔ اس کتاب میں انفرادی زندگی کی اصلاح پر زیادہ زور دیے جانے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ تعلیماتِ الٰہیہ پر خواہ وہ عقائد ہوں یا عبادات، معاملات ہوں یا اخلاقیات، پورے طور پر عمل کرکے جب افراد بہتر ہو جائیں گے تو اجتماعی زندگی پر اس کا یقیناً خوشگوار اثر پڑے گا؛ اللہ تعالیٰ کا شاہکار (انسان) اس پُرامن اور پُرسکون ماحول میں اپنی خداداد صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرکے تسخیرِ کائنات کر سکے گا اور صحیح معنیٰ میں زمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ یا اس دنیا کا بادشاہ کہلانے کا مستحق بن جائے گا۔

زیرِ نظر کتاب میں اسلامی تعلیمات کو ایسے ڈھنگ سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو درجۂ اعتدال کے عقلیت پسند طبقے کے لیے قابلِ قبول ہو، میرا مقصد اُس طبقے سے ہے جو انسانی عقل کے صحیح حدود پہچانتا ہو، کسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو، اور اپنی عقل سے اتنا کام نہ لینا چاہتا ہو جتنا کہ وہ نہیں کر سکتی۔ تمام یا اکثر اسلامی تعلیمات کی اس مختصر سی کتاب میں گنجائش نہ تھی، میں نے اپنے خیال اور ناقص تجربے کے مطابق جن باتوں کو ضروری سمجھا کسی خاص ترتیب کا لحاظ کیے بغیر یکجا جمع کر دیا ہے۔ اس مجموعے میں اُن افکار و خیالات کا بھی بہت کچھ حصّہ شامل ہے جن کا اظہار میں مختلف اوقات میں مسلم یونیورسٹی کے ان طلباء کے سامنے کرتا رہا ہوں جو سالہائے گذشتہ میں میرے زیرِ تعلیم رہے ہیں۔

راقم الحروف نے اس کتاب کا نام "اسلامی کشکول" رکھا ہے۔ کشکول فقیر یا سائل کے اس برتن کو کہا جاتا ہے جس کو لے کر وہ بھیک مانگنے نکلتا ہے اور جو کچھ

۱۵

عقلِ انسانی کی حدود

اس میں کون شک کرسکتا ہے کہ آج دنیا مادّی اعتبار سے بہت زیادہ ترقی کر چکی ہے، اور ابھی یہ کہنا مشکل ہے کہ اس ترقی کی آخری منزل کیا ہوگی اور وہ کب آئے گی، مادّی علوم کی ترقی کے لئے انسان اپنی صلاحیتوں کو برابر استعمال کر رہا ہے۔ اور ڈھنگ یہ بتلا رہا ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی انہماک سے اپنی اس جدّ وجہد کو جاری رکھے گا۔ انسان نے مادّیت کے میدان میں کس کس قسم کی ترقی کی ہے، اس کا ذکر یہاں مقصود نہیں، بلکہ بتانا یہ ہے کہ انسان کی مادّی ترقی سے انسانیت کو بھی کچھ نفع پہنچا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب ہم کو بجائے "ہاں" کے "نہیں" میں ملتا ہے، ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ انسان پستی کی طرف جا رہا ہے، اخلاقی عادات برابر گرتی جا رہی ہے، جرائم بڑھ رہے ہیں، کارخانوں، یونیورسٹیوں، کالجوں، اسکولوں اور گھریلو زندگی میں سرکشی اور نافرمانی حد سے زیادہ بڑھ چکی ہے، خودغرضی

یہ نقشِ اوّل ہے، اور اس کا نام "اسلامی کشکول" رکھ کر در حقیقت میں نے اپنی علمی بے مائیگی اور خامیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے، اور کسی دوسری فرصت میں اہلِ ذوق و دینی علوم کے شائقین کے لئے نقشِ ثانی کو اس سے بہتر صورت میں پیش کرسکوں۔

مجھے اپنی کوتاہیوں کا پورے طور پر احساس ہے، جو بن پڑا وہ اس امّید پر کیا کہ آئندہ دوسرے اس سے بہتر کریں گے۔ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکّلت والیہ انیب۔

منظہرالدین

سوچنے کی بجائے امن وشانتی کے لئے سوچنے لگیں۔

یہ علم، یہ حکمت، یہ تدبّر، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو، دیتے ہیں تعلیم مساوات
بیکاری وعُریانی ومیخواری وافلاس!
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق وبخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات (اقبالؒ)

اوپر لکھی ہوئی باتوں کو سمجھانے یا ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو وہ واقعات ہیں جو آئے دن ہماری نگاہوں کے سامنے سے گزرتے رہتے ہیں۔ کیا ان واقعات کے بعد بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ صرف مادّی ترقی انسان کو دلی اطمینان بخش سکتی ہے، آخرت کی زندگی کا یہاں ذکر نہیں، کیا اس دنیا کی زندگی کو انسان صرف اپنی عقلی تدابیر کو کام میں لاکر کامیاب بنا سکتا ہے؟ جب جواب نہیں ہے اور یقیناً نہیں تو کیا پھر یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ تنہا عقلِ انسانی اور اس کی ایجادات انسانی سعادت اور انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کے لئے ناکافی ہیں، وہ اس دنیا کی زندگی میں بھی روحانی تعلیمات کا محتاج ہے، کیونکہ دنیاوی ترقی اگر انسانی فطرت کا مقتضیٰ ہے اور کوئی سچا دین انسان کو اس ترقی کے حاصل کرنے سے نہیں روکتا تو اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی فطرت کا جھکاؤ

سکا یہ عالم ہے کہ دوسرے انسان کے فائدے یا نقصان کی کوئی اہمیت نہیں، اپنا فائدہ ہونا چاہیئے، اور اگر اس سے دوسرے کو نقصان پہنچتا ہے تو پہنچا کرے۔

اب ذرا اُن ملکوں کی حالت پر بھی غور کیجیے کہ جو علم و تہذیب کے اوجِ کمال پر ہیں، جن کا تمدّن ٹکسالی مانا جاتا ہے، جنھوں نے اپنی عقل کی تمام صلاحیتوں کو نئے نئے آلاتِ جنگ کی ایجاد کے لئے لگا دیا ہے، جن کے ذمّہ دار لوگوں کی تقریریں اور تحریریں انسانی دماغوں اور دلوں میں اُلجھن اور پریشانی کے سوا کچھ اور پیدا نہیں کرتیں، جنھوں نے اپنی ذہانت کو تمام تر اپنی قوم اور ملک کے لوگوں کے فائدے کے لئے وقف کر دیا ہے، خواہ ساری دنیا کے انسانوں کو تباہ و برباد کیوں نہ کر دینا پڑے، جو ہر سال بڑے بڑے جلسے اور کانفرنسیں انسانی حقوق کی حفاظت کے لئے کرتے ہیں اور اُن پر بے دریغ لاکھوں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، لیکن اُن میں سے ہر شخص اپنے دل میں یہی سمجھتا ہے کہ انسانیت صرف اس کی قوم اور ملک کے ساتھ مخصوص ہے، جنھوں نے موقع ملنے پر اپنے ان ہی آلاتِ جنگ سے انسانوں کے تباہ و برباد کرنے میں ایک سیکنڈ کی فرصت کو ضائع کرنا کم عقلی اور بے وقوفی خیال کیا، اور تباہ کرتے وقت عورت، بچّے، بوڑھے اور مریض پر اس لئے رحم نہیں کیا کہ یہ لوگ دشمن کے علاقے میں تھے، جو انسانوں کی کمائی ہوئی دولت کا ایک بڑا حصّہ جنگ کی تیاریوں اور انسانوں کو تباہ کرنے کے لئے خرچ کرتے رہتے ہیں، ساری دنیا کی یہ تمام دولت جو آج سامانِ جنگ کی تیاریوں پر خرچ کی جا رہی ہے، اگر انسانوں اور انسانیت کی بھلائی کے لئے خرچ کی جائے تو غالباً دنیا کے بہت سے انسانوں کی اکثر و بیشتر مصیبتیں اور پریشانیاں دور ہو جائیں، اور لوگ جنگ کے لئے

انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں، اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت اور استعمار کے جوش میں لاکھوں کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پامال کر ڈالا، صرف اس واسطے کہ اُن کے اپنے مخصوص گروہ کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا جائے۔

انھوں نے کمزور قوموں پر تسلّط حاصل کرنے کے بعد اُن کے اخلاق، ان کے مذہب، ان کی معاشرتی روایات، اُن کے ادب، اور اُن کے اموال پر دستِ تطاول دراز کیا، پھر اُن میں تفرقہ ڈال کر ان بدبختوں کو خوں ریزی اور برادر کشی میں مصروف کر دیا، تاکہ وہ غلامی کی افیون سے مدہوش و غافل رہیں، اور استعمار کی جونک چپ چاپ اُن کا لہو پیتی رہے۔"

اپنے اسی پیغام میں اقبال فرماتے ہیں:-

"سائنس کے تباہ کن آلات سے تمدّنِ انسانی کے عظیم الشان آثار کو معدوم کیا جا رہا ہے، اور جو حکومتیں فی الحال آگ اور خون کے اس تماشے میں عملاً شریک نہیں ہیں وہ اقتصادی میدان میں کمزوروں کے خون کے آخری قطرے تک چوس رہی ہیں۔ تمام دنیا کے اربابِ فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ تہذیب و تمدّن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کی جان و مال کے لاگو ہو کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں، دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔ جب تک تمام دنیا کی قوتیں اپنی توجّہ کو محض احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔"

دین اور مذہب کی طرف بھی ہے، لیکن سماج اور ماحول کے اثر سے فطرتِ انسانی کا دین و مذہب کی طرف یہ جھکاؤ اتنا کم ہوتا جاتا ہے کہ اس کو دوبارہ اپنی اصلی حالت پر لانے کے لئے ایک ساز گار ماحول وسماج کی ضرورت ہے، جس کا بہم پہنچانا موجودہ حالات میں کوئی آسان کام نہیں ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے آل انڈیا ریڈیو لاہور کی درخواست پر یکم جنوری ۱۹۳۵ء کے نئے سال کے موقعے پر جو پیغام دیا تھا اس کا ایک ایک لفظ یہ ظاہر کرتا ہے کہ دورِ حاضر کے علوم عقلیہ انسانیت کی تعمیر و ترقی میں ناکام رہے ہیں، انسان مادیات کی ترقی کے خیال میں الجھ کر اخلاقی قدروں سے غافل ہو گیا ہے۔ اس پیغام کی چند سطریں یہ ہیں۔

"دورِ حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقی پر بڑا فخر ہے، اور یہ فخر و ناز یقیناً حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں، اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کرلی ہے، لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت اور نہ جانے کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں، ان نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبروں کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سپرد کی گئی ہے وہ خونریزی، سفاکی اور زیر دست آزاری کے دیوتا ثابت ہوئے؛ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاق انسانی کے نوامیسِ عالیہ کی حفاظت کریں،

نکلنے کے بعد یہ بالکل فنا نہیں ہوتی بلکہ فضا میں باقی رہتی ہے، تو کوئی بھی یقین نہ کرتا،
لیکن اب جبکہ ان ہی میں سے چند عقلمندوں کی بحث و تحقیق سے یہ ثابت ہو رہا ہے
کہ انسان کے بولے ہوئے الفاظ فنا نہیں ہوتے بلکہ فضا میں موجود رہتے ہیں، یہ اور
بات ہے کہ ہم کو سنائی نہ دیں، تو ہر شخص کو یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے، بلکہ یہاں تک
ماننے کو تیار ہے کہ سینکڑوں برس پہلے لوگوں نے جو تقریریں کی تھیں اُن کو کچھ عرصے
کے بعد سنا جا سکے گا۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ جب آواز جیسی چیز کہ جو مادی نہیں ہے
اور بظاہر فنا ہو جاتی ہے اور کسی قسم کا جسم نہیں رکھتی، غیر معمولی ذرائع کے استعمال
سے صدہا بلکہ ہزارہا برس کے بعد بھی سنی جا سکتی ہے اور اس کو دوبارہ واپس لایا
جا سکتا ہے تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ انسان کا جسم جو کہ ایک مادی چیز ہے اُس کے ان
اجزا کو جو سائنس کے اصول کی بنا پر فنا نہیں ہو سکتے کسی ایسے ذریعے سے کہ جس کی
حقیقت عقلِ انسانی کو معلوم نہیں ہو سکی ہے دوبارہ ترتیب دے کر اُن میں جان
ڈال دی جائے گی، اور یہ امر مسلم ہے کہ کسی چیز کے نہ جاننے یا نہ جان سکنے سے یہ
لازم نہیں آتا کہ وہ چیز حقیقتاً بھی موجود نہیں ہے تو کہا جاتا ہے کہ ایسا ہونا قطعاً
ناممکن ہے۔ ناممکن تو ریڈیو کی ایجاد سے پہلے دہلی میں بیٹھ کر امریکہ میں بولنے والے
شخص کی آواز سننے کو بھی کہا گیا تھا، اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ناممکن صرف ممکن ہی نہیں
بلکہ واقعہ بن گیا، ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح سے مردہ جسموں میں جو کہ بظاہر فنا ہو گئے
ہیں، اور جن میں آپ کے خیال کے مطابق دوبارہ جان پڑنا ناممکن ہے ایک ایسا
وقت آئے گا کہ یہ ناممکن بھی ممکن ہو جائے گا، بلکہ واقعہ کی صورت اختیار کر لے گا۔
اس قسم کی بہت سی باتیں ہیں جو ابتدا میں بالکل مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں، اور

یورپ کے مفکّرین کو موجودہ تہذیب کے کھوکھلے ہونے کا احساس ہو چلا ہے، اور کہنے لگے ہیں کہ اس تہذیب کے ساتھ ساتھ انسانی تربیت کے لئے روحانی ہدایات ضروری ہیں، مذہبی تعلیمات اور ان پر عمل کئے بغیر اس تہذیب کے ساتھ چلنا اپنے آپ کو تباہی اور ہلاکت کے گڑھے میں ڈال دینا ہے، اس تہذیب کے زہر کا اُتار صرف روحانی تعلیمات ہیں، جو انسان کی عقل کو بھٹکنے اور بہکنے سے بچا سکتی ہیں: اور ان ہی کے ذریعے انسان انسانیت کا احترام سیکھ سکتا ہے۔

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں کہ آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات (ڈاکٹر اقبال)

عقلِ انسانی کی کوتاہی اور اس کے محدود ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسان جس چیز کے متعلق اپنی عقل کا پورا زور لگا کر بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ بات تو عقل میں نہیں آتی، یہ ہو ہی نہیں سکتا، وہی چیز مادّی علوم کی روز افزوں ترقی سے جب عالمِ وجود میں آجاتی ہے یا کوئی نیا انکشاف ہو جاتا ہے تو فوراً اپنی پہلی رائے کے خلاف اُس کو عین ممکن کہنے لگتا ہے، ریڈیو کی ایجاد سے پہلے اگر کسی سمجھدار انسان سے یہ کہا جاتا کہ تم دہلی میں بیٹھ کر امریکہ میں بولنے والے شخص کی آواز سن سکو گے تو وہ اُس کو مذاق کی بات سمجھتا، اور ماننے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ لیکن اس کی ایجاد کے بعد اب یہ بات کسی کو بھی ناممکن معلوم نہیں ہوتی۔ انسانی آواز کے متعلق آج سے چند سال پہلے اگر یہ کہا جاتا کہ انسان کے منہ سے

تو اس سے قطعاً انکار کر بیٹھے۔

آزادیٔ افکار سے ہے اُن کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ (اقبالؒ)

" یہ کھُلی ہوئی بات ہے کہ انسان مختلف طریقوں سے بے انتہا چیزوں کو سمجھتا ہے، لیکن اُن کے سمجھنے کے ذرائع دراصل صرف پانچ ہیں، جن کو حواسِ خمسہ کہا جاتا ہے" اور وہ یہ ہیں، قوّتِ باصرہ (دیکھنے کی قوت) قوتِ ذائقہ (چکھنے کی قوت) قوتِ شامہ (سونگھنے کی قوت) قوتِ سامعہ (سننے کی قوت) قوتِ لامسہ (چھونے کی قوت) ان پانچ حواس سے پانچ قسم کا علم انسان کو ہوتا ہے، اِن کے سوا چھٹی قسم کا انسان تصوّر بھی نہیں کرسکتا، جس کی یہ پانچوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں، ان میں سے اگر کوئی شخص کسی ایک سے بھی پیدائشی طور پر محروم ہو تو جو علم اس قوت سے حاصل ہوتا ہے وہ شخص اس کا تصوّر بھی نہیں کرسکتا، ایک پیدائشی اندھا کسی طرح سیاہی، سفیدی، سرخی اور زردی کے فرق کو نہیں سمجھ سکتا، حالانکہ دیکھنے کی قوت کے سوا اس میں عقل اور دوسرے تمام حواس موجود ہیں، مگر نہ تو خود اس کی عقل رنگوں کے فرق کو سمجھ سکتی ہے اور نہ کوئی دوسرا شخص، خواہ وہ کتنا ہی بڑا فلاسفر کیوں نہ ہو، اس کو رنگوں کا فرق سمجھا سکتا ہے۔ وہ محض تقلیداً اور لوگوں کی بات مان کر اس فرق کا اقرار کرتا ہے، کیونکہ اس کے پاس اس فرق کو جاننے کے لئے اور کوئی دوسرا ذریعہ ہی نہیں ہے، حالانکہ آنکھ والوں کے نزدیک یہ فرق اتنا

سنجیدہ لوگ بھی ہنس کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا، لیکن زیادہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ ان کا پہلا فیصلہ نئے تجربوں کی روشنی میں غلط ثابت ہونے لگتا ہے، چاند کی طرف سفر اور وہاں کسی مخلوق کا آباد ہونا آج سے چند سال پیشتر کس قدر تعجب خیز اور عقلِ انسانی میں نہ آنے والی بات تھی، لیکن کیا اب بھی لوگوں کا تعجب اور انکار اسی درجے پر باقی ہے، جب کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس قسم کی ایجادات ہو سکتی ہیں کہ انسان ایک گھنٹے میں ہزاروں میل کا سفر طے کرنے کے قابل ہو جائے اور کیا سائنس کی اس قسم کی ایجادات وحی الہٰی، واقعۂ معراج اور دوسرے مذہبی معتقدات کو عقلِ انسانی سے قریب تر لانے میں مددگار ثابت نہ ہوں گی؟

غور کرنے والے پورے طور پر غور نہیں کرتے، ورنہ یہ نت نئی ایجادات انسان کو مذہب سے برگشتہ کرنے والی نہیں ہیں بلکہ اس کے ایمان کو اور زیادہ پختہ کرنے والی ہیں۔ لیکن سائنس کے نظریات کو مذہبی عقائد کے لئے بنیاد نہ بنانا چاہیئے، کیونکہ وہ بدل سکتے اور بدلتے رہتے ہیں، البتہ مزید اطمینانِ قلب کے لئے سائنس کے نظریات سے شہادتیں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ دوسرے مذاہب کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہتا لیکن مذہبِ اسلام نے تو انسان سے اس کائنات کی ہر چیز پر غور و فکر کا مطالبہ کیا ہے تاکہ وہ قدرت کے بے شمار خزانوں سے فائدہ اٹھا کر کسی بالا ہستی کا قائل ہو جائے، اور اپنی عقل کی حدود کو صحیح طور پر پہچانے، صحیح حدود کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے متعلق فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرے، اور غور و فکر کئے بغیر یہ نہ کہنے لگے "ایسا ہو ہی نہیں سکتا"۔ "یہ بات ہماری عقل میں نہیں آتی اس لئے ممکن نہیں"۔ اس کے ساتھ یہ بھی نہ کرے کہ جو چیز اس کی عقل میں نہ آئے اور اس کو محسوس نہ کرسکے

اسی قدر اس کی عقل بھی کام کرے گی، کیونکہ ایسے شخص کو قیاس کے ذرائع زیادہ حاصل ہوں گے، سمجھنے اور نتائج نکالنے کا راستہ صاف ہوتا جائے گا، پیدا ہونے کے بعد ہی سے بچّے کے حواس کام کرنے لگتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی زبان سے اس کا اظہار نہ کرسکے۔ نمک کی ایک کنکری بچّے کو خوب دکھا کر اس کے منہ میں ڈال کر دیکھئے کہ کیسا منہ بناتا ہے، کیونکہ اُس کی قوّتِ ذائقہ (چکھنے کی قوت) کام کر رہی ہے، اسی طرح کڑوی چیز بھی منہ میں ڈالنے سے پھر ضرور منہ بنائے گا۔ وہ عقل و سمجھ بھی رکھتا ہے، لیکن چونکہ محسوسات اور تجربات کا ذخیرہ اُس کے پاس بہت کم ہے، اور قیاس کرنے کی صلاحیت اُس میں پیدا نہیں ہوئی ہے، اس لئے بہت ممکن ہے کہ وہ کوئی کڑوی چیز یا کہیں نمک رکھا ہوا دیکھے اور اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لے۔ عمر کے ساتھ جس قدر سمجھ بڑھتی جائے گی اور جس ماحول میں پرورش پائے گا اسی کے تجربے اُس کو حاصل ہوں گے۔ طبیب کو معالجات میں، انجینئر کو فنِ تعمیر میں، خطیب کو فنِ خطابت میں اور وکیل کو قانون میں۔ ایک وکیل قانون میں ایسی ایسی باریکیاں پیدا کرتا ہے کہ بڑے بڑے سمجھ دار لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے فن پر کہ جس سے وہ بالکل واقف نہیں، اگر اس سے گفتگو کی جائے تو بچّوں کی سی باتیں کرنے لگتا ہے، حالانکہ وہ عقل و سمجھ بھی رکھتا ہے۔

اب رہ گئیں وہ چیزیں کہ جن کا علم حواس و تجربات کے ذریعہ حاصل نہیں ہوسکتا، تو ایسی چیزوں کا علم عقل کے ذریعے بھی حاصل نہ ہوسکے گا، کیونکہ یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ عقل کا کام یہ ہے کہ محسوسات، معلومات اور تجربات کو ذریعہ بنا کر وہ ان چیزوں کو جان لیتی ہے جو محسوس اور معلوم نہ تھیں۔ یہ بات مثال سے ذرا اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی:۔ کسی بڑے عقلمند کے پاس فریقین اپنا مقدمہ لے کر آتے ہیں،

کھلا ہوا ہے کہ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے تمام حواس کا بھی یہی حال ہے، جس قسم کا علم جس حاسہ سے ہوتا ہے اگر انسان اس حاسہ سے محروم ہو تو کسی دوسرے ذریعے سے اس طرح کا علم ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔

علم کا ایک ذریعہ اور ہے جس کو عقل کہتے ہیں، غیر محسوس چیزوں کو انسان عقل کے ذریعے جان لیتا ہے لیکن اس کے ذرائع بھی محسوسات ہوتے ہیں، حواس کے ذریعے سے جو چیزیں انسان کو معلوم ہوتی ہیں عقل اُن ہی کو مناسب ترتیب دے کر غیر محسوس نتیجہ نکال لیتی ہے، اور بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس نتیجے کو سامنے رکھ کر عقل تجربوں اور قیاس کے میدان میں اپنی جولانی دکھا کر مختلف علوم وفنون کی موجد بن جاتی ہے، ورنہ حواسِ خمسہ تو دوسرے حیوانات بھی رکھتے ہیں۔ انسان میں صرف ایک عقل ہی تو زیادہ ہے جس نے انسان اور انسانی طاقت کو اس درجہ بلند کر دیا ہے کہ تمام مظاہر قدرت اس کے تابع اور فرماں بردار نظر آتے ہیں، اور اسی عقل کی مدد سے انسان نے صدہا علوم وفنون ایجاد کئے، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمام علوم عقلیہ دلائل اور نتائج کے اعتبار سے برابر نہیں ہیں، مثلاً علوم ہندسہ صحت ویقین کے اعتبار سے اوّل ہونے کا مرتبہ رکھتے ہیں، برخلاف اس کے علم ہیئت اور فلکیات کے بہت سے مسائل میں آج بھی شکوک وشبہات باقی ہیں۔

جب عقل کا کام یہ ٹھہرا کہ وہ محسوسات، معلومات اور تجربات کو ذریعہ بنا کر ان چیزوں کو جو محسوس اور معلوم نہیں معلوم کر لیتی ہے تو اس سے یہ بات بھی ہماری سمجھ میں آ گئی کہ جس شخص کا علم محسوسات اور تجربات کے ذریعے جتنا زیادہ ہوتا جائے گا

باقی نہیں رہی ہے، انسان نے سب کچھ معلوم کرلیا؟ نہیں، بلکہ ابھی بہت کچھ جدید انکشافات کا امکان باقی ہے، انسانی ذرائع اور وسائل ترقی کے محتاج ہیں۔ جس قدر ان میں ترقی ہوگی انکشافات وایجادات کا سلسلہ بھی ترقی کرتا رہے گا۔

" لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے علم کا ذریعہ یا تو باقی نہیں رہا، یا جن کے دریافت کا ذریعہ انسان کو حاصل ہی نہیں ہے، اس لئے ان چیزوں کا صحیح علم عقل کے ذریعے انسان کو نہیں ہوسکتا، مثلاً مادیات کی یہ دنیا کب سے ہے اور کیوں کر پیدا ہوئی؟ بغیر کسی کے بتائے ہوئے یا قرائن کے ہم محض عقل سے اس کو نہیں جان سکتے، یا مثلاً قیامت کب آئے گی؟ یہ دنیا کب فنا ہوگی؟ یہاں بھی عقل کام نہیں کرتی، یا یہ کہ مادیات کے علاوہ اور جن چیزوں کی خبر پیغمبر دیتے ہیں جیسے فرشتے، جنت اور دوزخ وغیرہ واقعی موجود ہیں یا نہیں؟ یہ غیر مادی چیزیں ہیں، جن کے علم کا ذریعہ عقل کو حاصل نہیں ہے، اور نہ حواس سے جانی جاسکتی ہیں۔ ان چیزوں کو صرف عقل سے دریافت کرنے کی کوشش کرنا عاقل اور ذی ہوش کا کام نہیں ہے[1]۔"

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ
آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد (اقبالؒ)

ان چیزوں کے متعلق عقلی فیصلے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ جن لوگوں نے ان چیزوں کے موجود ہونے کی خبر دی ہے یعنی پیغمبر علیہم الصلوٰۃ والسلام، ان کی پوری زندگی کو جانچا اور پرکھا جائے، دل ودماغ کو ہر قسم کے تعصب سے خالی کرکے غور کیا جائے کہ اس قسم کے لوگ کہ جنھوں نے نازک سے نازک موقع پر اپنی جان بچانے کے لئے

---

[1] ملخص از اسلام اور موجودہ مدنی مسائل صفحہ ۱۴-۱۵

کیا یہ عقلمند بہت اچھی عقل و سمجھ رکھتے ہوئے بھی اس مقدمے کی تفصیل، گواہوں کے بیانات اور ضروری معلومات حاصل کئے بغیر صرف اپنی عقل کی مدد سے کوئی فیصلہ کر سکے گا؟ ہرگز نہیں، اور اگر فیصلہ کرے گا بھی تو وہ عقل کا فیصلہ نہ کہلائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم سے پہلے اس دنیا میں بڑے بڑے سلاطین گزرے، خدا کے برگزیدہ بندے آئے، فلاسفر و حکما پیدا ہوئے، اور اس دنیا میں بڑے بڑے واقعات پیش آئے، لیکن صرف عقل کی مدد سے ان واقعات میں سے ہم کسی ایک کو بھی نہیں جان سکتے، البتہ مختلف ذرائع سے ان باتوں کے متعلق جب ہم کو تھوڑا بہت علم ہوتا ہے تو اپنے علم اور تجربات کی روشنی میں اُن میں سے بہت سی باتوں کو ہم صحیح اور بہت کو غلط سمجھنے لگتے ہیں، اور عقل کو فیصلہ کرنے کا موقع ملتا ہے، لیکن ان ذرائع کے بغیر عقل کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، اور ابھی تو اس مادّی دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جو بظاہر انسانی عقل کی حدود سے باہر ہیں، لیکن ان کے متعلق یقینی طور پر یہ حکم لگانا صحیح نہ ہوگا کہ انسان کی عقل ان تک نہیں پہنچ سکتی۔ ہوسکتا ہے کہ ان چیزوں کے حاصل کرنے کے جو ذرائع انسان کو اب تک بہم پہنچے ہوں وہ ناکمل ہوں، آئندہ چل کر جب مکمل ذرائع حاصل ہو جائیں گے تو ان چیزوں تک بھی رسائی ہو جائے گی۔ چاند کس چیز سے بنا ہے، ستاروں کا آپس میں فاصلہ کتنا ہے، سمندر کی تہ میں، زمین کے اندر اور ہوا میں فطرت کے کیا کیا خزانے پوشیدہ ہیں؟ جہاں تک انسان کے وسائل نے کام کیا ہے اس نے بہت کچھ معلوم کر لیا ہے، لیکن کیا یہ بات قطعی طور سے کہی جاسکتی ہے کہ اب کوئی اور چیز چاند، سورج، زمین، سمندر اور ہوا وغیرہ میں معلوم کرنے کے لئے

---

[1] ملخص از اسلام اور موجودہ مدنی مسائل صفحہ ۱۲ تا ۱۴ (مولانا حکیم محمد عبد الرؤف صاحب داناپوری)

عقلِ انسانی کے محدود ہونے کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوگا کہ علوم و فنون میں ہر قسم کی ترقی کے بعد بھی وہ آج تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ خود اس کی عقل کیا چیز ہے، وہ کیسے اور کیوں کر ہزاروں اور لاکھوں چیزوں کا ادراک کرتی ہے۔ یہ لاتعداد چیزیں اور باتیں انسانی دماغ کے کس پردے میں محفوظ رہتی ہیں۔ بہت زور لگا کر یہ کہا گیا کہ جو چیزیں انسان دیکھتا ہے اُن کا عکس انسان کے دماغ میں چھپ جاتا ہے لیکن کسی بڑے سے بڑے ماہر ڈاکٹر نے آج تک یہ نہیں بتایا کہ فلاں شخص کا دماغ چیرا گیا اور اس میں ہزاروں عمارتوں، کتابوں، الماریوں، میزوں، کرسیوں، انسانوں، غرض جتنی چیزیں اُس نے اپنی عمر میں دیکھی تھیں سب کے عکس دیکھے گئے۔ ایسی کمزور عقل کا فیصلہ ان باتوں میں کہ جو صرف عقل سے جانی ہی نہیں جاسکتیں کہاں تک معقول ہوگا، اگر ماہر انجینئر کی بات فنِ تعمیر میں، ڈاکٹر و طبیب کی رائے معالجات میں، وکیل کی بات مقدمات میں، ماہر نباتات کی بات نباتات کے معاملے میں، غرض ہر وہ شخص جو کسی فن کا ماہر کہلاتا ہے جب ہم اس کی ہر بات اس فن کے بارے میں ماننے کو تیار ہو جاتے ہیں تو یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ روحانیات کے ماہر پیغمبر اگر ہم کو کوئی بات بتائیں تو بغیر غور کئے ہوئے ہم یہ کہنے لگیں کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے، اور ہماری سمجھ میں نہیں آتی اس لئے نا قابلِ قبول، غیر معقول اور غلط ہے۔

عقلیت پسند اور مذہب

اس زمانے میں روشن خیال تعلیم یافتہ طبقے میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد موجود ہے جو خود کو سمجھ دار کہتے اور عقلیت پسندی کو اپنا شعار بتاتے ہیں، لیکن یہی لوگ جب مذہب پر بحث کرتے ہیں تو بحث کے اصول کو بالکل بھول جاتے یا بھلا دیتے ہیں۔ کیا یہ

بھی خلاف واقعہ بات کہنا پسند نہ کی، اور جن کی سچائی کا اُن کے دشمنوں نے بھی اقرا
کیا، جنھوں نے ساری دنیا کو چیلنج کر کے انسانیت کے خلاف جو بغاوت جاری تھی اُسے
روکا، جنھوں نے دوسروں کی آبادی کی خاطر اپنے گھروں کو اُجاڑا، اور جن کے سامنے
دنیا کی لذّتیں اور دولتیں لائی گئیں، مگر انھوں نے سب کو ٹھکرا دیا۔ ایسے برگزیدہ ا
سچے لوگ اگر جنّت اور دوزخ اور ایسی باتوں کی خبر دیں کہ جن تک عام عقلِ انسانی کی
رسائی نہیں ہو سکتی تو اُن کو جھٹلانا کیا کم عقلی کی بات نہ ہوگی؟ اور یہ کہہ کر کسی بات کے
ماننے سے انکار کر دینا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی، یا ہماری عقل اس کو قبول نہیں کرتی
یہاں تک معقول ہوگا، دنیا کے بہت سے معاملات میں جب دوسروں کی بات پر بھروسہ
کر کے ہم ان کا یقین کر لیتے ہیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ خدا کے سچّے رسول کوئی بات
کہیں تو ہم اس میں شک کریں۔ علاّمہ ابن خلدون مغربی نے عقلِ انسانی کی حدود کو
ذیل کی عبارت میں واضح کیا ہے۔

"عقل کا کام ادراک ہے لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جن کا ادراک انسانی
عقل نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ چیزیں حدِ ادراک سے باہر ہیں، اور اس سے یہ لازم نہیں
آتا کہ عقل بیکار ہے، وہ اپنا کام برابر کر رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود توحید، احوالِ
آخرت، صفاتِ الٰہیہ اور نبوّت کی حقیقت وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ جو عقل سے جانی نہیں
جا سکتیں، اور اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص سونا چاندی تولنے کے ترازو کو دیکھ کر
اس سے کسی پہاڑ کے تولنے کا تصوّر کرنے لگے، وہ ترازو اگر پہاڑ کو نہ تول سکے تو یہ
کہنا صحیح نہ ہوگا کہ ترازو فضول اور بیکار ہے۔ یہی حال انسان کی عقل کا ہے کہ کچھ چیزیں
اس کی رسائی سے باہر ہیں[1]۔"

---

[1] مقدمہ ابن خلدون مطبوعہ مصر صفحہ ۴۰۱

نہیں۔ عربی گرامر سے تھوڑی بہت واقفیت ہو یا نہ ہو، قرآن کریم کی آیات پر غور و تدبر کا طریقہ آتا ہو یا نہ آتا ہو، مگر اس کے باوجود یہ سننے میں آتا ہے کہ فلاں بیرسٹر صاحب یا فلاں ماہر نباتیات کی رائے قرآن کے فلاں مسئلے کے متعلق یہ ہے، بیرسٹر کی رائے ملکی قوانین کے بارے میں مانی جا سکتی ہے، ماہر نباتیات کی رائے نباتیات میں ضرور قابلِ قبول ہو سکتی ہے، لیکن مذہب اسلام کے بارے میں ان لوگوں کی رائے اُس وقت تک قابلِ تسلیم نہیں جب تک کہ کوئی قرآن و حدیث پر نظر رکھنے والا ان کی بات کی تصدیق نہ کر دے، یا یہ کہ یہ لوگ قرآن کریم اور احادیث نبوی پر خود گہری نظر رکھتے ہوں، اور کسی مستند عالم کی نگرانی میں دینی کتابوں کا مطالعہ کیا ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن و حدیث کے سمجھنے میں کسی خاص جماعت کی اجارہ داری ہے، اور اس جماعت کے علاوہ کسی کو یہ حق نہیں کہ ان پر غور کرے اور سمجھے، قرآن کریم نے بار بار اپنے پڑھنے والوں کو غور و تدبر کی طرف بلایا ہے، اور ٹھنڈے دل سے سوچنے کی دعوت دی ہے، تجربے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جو لوگ پابندی سے قرآن کریم کی تلاوت کرتے اور اس کی آیات پر غور کرتے رہتے ہیں اُن کے دل سے رفتہ رفتہ تمام شکوک و شبہات مٹ جاتے ہیں۔ اس عقلیت کے دور میں کوئی شخص کیمیا، طبیعیات، حیوانیات، غرض کسی علم کے کسی مسئلے پر بغیر اس علم سے کافی واقفیت حاصل کئے ہوئے اعتراض کرنے کی جرأت نہیں کرتا، وہ جانتا ہے کہ یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ وہ کسی علم کو پڑھے اور کافی معلومات حاصل کئے بغیر محض لوگوں سے سن کر اعتراض کرنے لگے، حیرت کی بات ہے کہ مذہب کو اس عقلی قاعدے سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے، قرآن کریم اور حدیث نبوی سے بالکل ناواقف لوگ بڑی جرأت رندانہ کے ساتھ اسلام پر رائے زنی کرتے اور اعتراضات

حقیقت نہیں ہے کہ کسی مسئلے پر گفتگو کرنے اور اُس کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کو اس کے متعلق کچھ نہ کچھ صحیح اور مستند معلومات ہوں، محض فرضی باتوں کو کسی چیز کی بنیاد مان کر قیاس آرائی کرنے سے کوئی صحیح نتیجہ کیسے برآمد ہو سکتا ہے۔ جب دنیا کی حکومتیں اپنے قوانین کی تشریح کا کام ہر کس و ناکس کے حوالے نہیں کرتیں، یہ کام صرف اُن لوگوں کے سپرد کیا جاتا ہے جو قانونی دماغ اور قانونی قابلیت رکھتے ہوں، جو آئینِ حکومت کی مصلحتوں اور اصطلاحاتِ علمی سے پورے طور پر واقفیت رکھتے ہوں، اور قانون پاس کر لینے کی سند رکھتے ہوں، تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ مذہب یا خدائی قانون کی تشریح کا اختیار ہر کس و ناکس کو دے دیا جائے، اور ایسا کرنا کہاں تک معقول ہوگا۔

ہر فن میں اُس کے ماہر کی رائے قابلِ قبول ہوتی ہے

جدید تعلیم یافتہ طبقے میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اسلامیات کا سطحی مطالعہ کرنے اور مستشرقین کی اسلام پر لکھی ہوئی چند کتابیں پڑھنے کے بعد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ اب انھیں اسلام کے متعلق سب کچھ معلوم ہو گیا، یہ کتنی بڑی بے انصافی ہے کہ انسانی دماغ کے بنائے ہوئے قانون کو سمجھنے کے لئے اپنی عمرِ عزیز کے دس دس اور پندرہ پندرہ سال صرف کر دیں، ہزاروں روپیہ بے دریغ خرچ کریں اور جب تک کوئی دوسرا ماہرِ قانون امتحان لے کر سند نہ دے دے اُس وقت تک تعلیم حاصل کرنے والے کی کوئی وقعت اور قیمت نہیں، اور نہ اُس کو قانون داں سمجھا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سمجھنے اور اس کی تعلیمات پر اظہارِ خیال اور اس پر تنقید کے لئے کوئی معیارِ قابلیت مقرر

حرج نہیں ہے، بلکہ اس سے ایمان و عقائد میں تازگی پیدا ہوتی ہے، لیکن غور کرنے کے بعد اگر کسی چیز کی مصلحت ہماری عقل میں نہ آسکے تو اس کے متعلق بیکار اور فضول ہونے کا فتویٰ صادر کرنا معقول نہ ہوگا۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات عقلِ انسانی کے عین مطابق ہیں۔

پروفیسر آرنلڈ (Arnold) نے اسلام کے عقلی مذہب ہونے کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن کا حاصل یہ ہے۔

اگر ہم ریشنلزم (Rationalism) کی تعریف یہ کریں کہ وہ ایک ایسے طریقے کا نام ہے کہ جس میں مذہبی عقائد کی بنیاد معقولیت پر ہوتی ہے تو یہ تعریف مذہب اسلام پر پورے طور پر چسپاں ہوتی ہے، تعلیمات کی سادگی اور اُن کا واضح ہونا، یہ دونوں باتیں مذہب کے لئے اہمیت رکھتی ہیں، مبلغین اسلام نے اپنے مذہب کی تعلیمات کو پیش کرتے وقت ان دونوں باتوں کا لحاظ رکھا ہے[1]۔

[1] دی پریچنگ آف اسلام صفحہ ۳۳۷ The Preaching of Islam By T. W. Arnold P. 337

کر بیٹھتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن کریم کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ آسان کتاب ہے، لیکن آسان ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے سمجھنے کے لئے کوئی اصول اور معیار مقرر نہیں ہے جب ہر علم و فن سیکھنے کے لئے معیار و اصول ہیں تو دینی علوم کے لئے بھی ضرور ہوں گے یہ بات قابلِ افسوس ہے کہ مسلمان اپنی بے توجہی کی وجہ سے اسلامی تعلیمات سے رفتہ رفتہ اجنبی ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دنیوی علوم کا نفع چونکہ اکثر و بیشتر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، اس لئے ان علوم کے سیکھنے کا پورا اہتمام کیا جاتا ہے، قابل اساتذہ تلاش کئے جاتے ہیں کسی اچھی درس گاہ کا انتخاب کیا جاتا ہے کہ جس میں بچے کو بھیجا جائے، اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر روپیہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا جاتا، اس کے برخلاف دینی علوم کی طرف جب خود والدین ہی کی توجہ نہیں ہے تو اولاد کیا سمجھ سکتی ہے کہ قرآن و حدیث میں کیا لکھا ہے؟ اسلامی عقائد کیا کیا ہیں، اور اس سے ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ لادینی افکار نئی نسل کے نوجوانوں کے دل و دماغ میں جگہ پکڑتے جا رہے ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے علومِ سائنس اور ان کے تمام متعلقات دینی علوم کی فہرست میں داخل ہو جاتے ہیں، بشرطیکہ اُن کو حاصل کرتے وقت یہ نیت کر لی جائے کہ خالقِ کائنات نے انسان سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ کائنات کی ہر چیز پر غور کرنے کے بعد اُس کی قدرت و عظمت کا صحیح اندازہ لگا کر اس کے سامنے جبینِ نیاز خم کر دے۔ مذہبی لوگوں کا وہ طبقہ کہ جو علوم جدیدہ کو علوم ہی نہیں سمجھتا درحقیقت قرآن کریم کی صحیح اسپرٹ سے واقف نہیں ہے، اور اس پر بھی جرم عائد ہوتا ہے جو دینی علوم کو علوم کی فہرست سے خارج کرنے والے لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ عبادات اور احکام پر غور کر کے اُن کے عقلی مصالح سمجھنے پر

اہل یورپ کی تقلید اور نقل کو سمجھتے آئے ہیں، یہ لوگ اپنے استاد کے لائق شاگرد نکلے، اور کہنے لگے کہ یورپ کے لوگوں نے دنیوی ترقی مذہب اور مذہبی پابندیوں کو چھوڑ کر کی ہے، ہم بھی کیوں نہ ایسا کریں، ان لائق شاگردوں نے اس پر غور نہ کیا کہ جس قسم کے حالات یورپ کے مذہبی پیشواؤں نے پیدا کر دئے تھے اور جن کی وجہ سے لوگ مذہب سے بیزار ہو گئے تھے، ویسے حالات مشرق میں کبھی پیدا نہیں ہوئے، اگر کبھی اور کہیں ایسا ہوا بھی ہے تو وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ دھرم اور مذہب کے ماننے والوں کی تعداد اب بھی یورپ میں اچھی خاصی ہے، یہ اور بات ہے کہ مادی علوم کو خدا ماننے والے بھی تعداد کے اعتبار سے کچھ کم نہیں ہیں، یہ متمدن لوگ شاید اس بات کو بھول گئے کہ اس طرزِ عمل سے اُن کو دلی سکون اور چین نصیب نہ ہوگا، کیونکہ علمی نظریات برابر بدلتے رہتے ہیں، کل جو نظریہ مان لیا گیا تھا کچھ عرصے کے بعد اس کو غلط بتایا جاتا ہے، وجہ ظاہر ہے کہ انسانی تحقیقات کسی ایک نقطہ پر نہیں ٹھہر سکتیں، جس قدر چھان بین کی جائے گی نئی نئی چیزیں معلوم ہوتی رہیں گی۔

جب علمی نظریئے بدلتے رہتے ہیں تو سیاسی، اقتصادی، اجتماعی اور معاشی حالات کا بدلنا اور اس طرح سے بدلنا کہ اُن کی تبدیلی میں کسی ایک نہ بدلنے والی قوّت کو مرکز کی حیثیت نہ دی گئی ہو، یقیناً لوگوں کو اُلجھن اور پریشانی میں ڈال دے گا، جیسا کہ ہم کو نظر آ رہا ہے، اور یہ کیا ضروری ہے کہ ایک قوم جس معاشی، سیاسی یا اقتصادی نظریئے کو اپنے لئے مفید سمجھتی ہو دوسری قوم بھی اس کو اپنے لئے صحیح اور مفید خیال کرے، کیونکہ ایک مرکز سے اُن کا تعلق نہیں ہے، دیکھنے میں یہ آ رہا ہے کہ اپنے نظریئے کے خلاف نظریہ رکھنے

مذہب کی ضرورت اور اُس کے فوائد

صرف یورپ میں نہیں بلکہ ایشیائی ملکوں میں بھی آج لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہ
کہہ رہی ہے کہ اب مذہب کی ضرورت نہیں، اب تو علم کا دور دورہ ہے، انسانی زندگی کا
وہ تاریک زمانہ گزر چکا جس میں وہ توہم پرستی اور دوسری مذہبی پابندیوں میں جکڑا ہوا
تھا۔ مشرقی ممالک میں مذہب کے خلاف یہ مہم بعد میں شروع ہوئی، اصل میں اس کا
سہرا مغرب کے سر ہے، شروع شروع میں یہ جنگ پادریوں اور کلیسا کے اُن صاحبِ
اقتدار لوگوں سے ہوئی جنھوں نے مذہب کا نام لے کر حکومت کی باگ ڈور اپنے
ہاتھوں میں لینا چاہی، اپنی اس آرزو کو پورا کرنے کے لئے ہر قسم کے مظالم جائز رکھے،
اور اپنے مخالفین کی کسی معقول بات کو سننا بھی پسند نہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے
کے بعد لوگ نہ صرف پادریوں بلکہ مذہب کے مخالف ہو گئے، اور مذہبی عقائد سے
بیگانگی ظاہر کرنے لگے۔ اس کا اثر ان مشرقی لوگوں پر بھی پڑا کہ جو اپنی کامیابی کا راز

مے خانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیرانِ خرابات (اقبالؒ)

اس میں شک نہیں کہ انسانی زندگی ایک کش مکش کی زندگی ہے، کسی حالت میں دلی اطمینان نصیب نہیں ہوتا، بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب ایک ہی عالم میں ہیں، کسی کو کم فکر ہے اور کسی کو زیادہ، لیکن ہے سب کو۔ اللہ کو یہ کب پسند ہے کہ اس کے بندے پریشان رہیں، اس نے بتا دیا کہ میری یاد کو دلوں میں زندہ رکھو، تمھاری پریشانیوں کے بادل خود بخود چھٹتے چلے جائیں گے، جس دل میں اللہ کی یاد رہے گی وہ فضول خیالات اور جھوٹی تمنّاؤں سے یقیناً پاک رہے گا، انسان اپنی امیدوں کی رسّی کو جس قدر کم کرتا چلا جائے پریشانیاں کم ہوتی چلی جائیں گی، امیدوں کی رسّی کو کم کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان کچھ نہ کرے، کچھ نہ سوچے، اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے، کیونکہ زندگی عمل کا نام ہے، اور اسلامی تعلیمات کے مخاطب زندہ لوگ ہیں نہ کہ مردہ۔

معاد یا عقیدۂ آخرت کی تفصیل تو آئندہ صفحات میں آئے گی، لیکن یہاں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ مذہبی عقائد میں عقیدۂ آخرت انسان کو دلی اطمینان بخشتا ہے، اس عقیدے کا ماننے والا جائز حدود میں رہ کر دنیا کی زندگی میں جد و جہد کے باوجود اگر کچھ چیزوں کو حاصل نہ کر سکے اور یہ خیال کرے کہ اس کی جو آرزوئیں پوری نہیں ہوئی ہیں وہ دوسری زندگی میں پوری ہو جائیں گی، اس دنیا میں مجھے اپنی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لئے کوئی کام ایسا نہ کرنا چاہیئے کہ جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے، اُن کے حقوق ضائع ہوں اور قیامت کے دن مجھ سے باز پرس ہو، ایسا شخص ناکامی

والی قوم کو دشمن اور مخالف سمجھا جاتا ہے، اُس کو نیست و نابود کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے، اور اس کدر فضا کا خمیازہ ان انسانوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے جو لاشعوری طور پر اس خراب ماحول میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اگر کسی مذہبی عقیدے کا صرف اتنا ہی فائدہ ہو کہ کسی اَن دیکھی قوت کو (اس کو اللہ کہا جائے یا کسی اور نام سے پکارا جائے) مان کر زمین پر بسنے والے انسان اپنے تمام کام اُس کی خوشنودی کے لئے کریں اور دلی اطمینان محسوس کرنے لگیں تو یہ بھی ایک بڑا فائدہ ہے۔ جو انسان اپنے ذہن میں کسی پیدا کرنے والے کا تصوّر نہیں رکھتا اور اس عالم کے بعد کسی اور دوسرے عالم پر اس کا اعتقاد نہیں ہے وہ اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ کر اس کی لذتوں کے حاصل کرنے میں لگ جاتا ہے، وہ یہ جانتا ہے کہ اس کی آرزوئیں، امیدیں اور تمنّائیں بہت زیادہ ہیں اور زندگی مختصر ہے، اس لئے جائز و ناجائز کا خیال کئے بغیر وہ اپنی آرزوؤں اور تمنّاؤں کے پورا کرنے میں لگا رہتا ہے، اس قسم کے طرزِ فکر کا نتیجہ یقیناً یہی ہوگا کہ لوگوں کے دلوں سے رحم و کرم، انسانیت و مروّت نکل جائے گی، اور دوسری برائیاں مثلاً خود غرضی، حرص و طمع، خواہشات کی پرستش اور کبر و نخوت وغیرہ اُن کی جگہ لے لیں گی، اُن افراد اور قوموں کی زندگی میں یہ تمام خرابیاں نمایاں طور پر نظر آرہی ہیں کہ جنھوں نے حصولِ دنیا ہی کو اپنی زندگی کا بڑا مقصد بنالیا ہے، اور ترقی کے بامِ عروج پر پہنچنے کے بعد بھی ان ہی مہذب اقوام کی بدولت دنیا تباہی کی طرف جارہی ہے، بڑے سے بڑا آدمی پریشان نظر آرہا ہے، اور اُس کو دلی چین نصیب نہیں۔ خدا سے بغاوت کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اور ڈرتے ہوں، اُن کے دلوں پر اس قانون کی اتنی ہیبت ہو کہ جو اُن کو قانون شکنی سے روکتی رہے۔

سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ کون سی چیز ہو سکتی ہے جو لوگوں کے دلوں پر قانون کی اتنی ہیبت اور اس کا اتنا اثر پیدا کر دے گی کہ لوگ قانون کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔ مذہبی معتقدات، اس کی اخلاقیات اور دین داری ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جو انسان کو برائیوں سے بچاتی، اُس کی اخلاقی تربیت کرتی اور لوگوں کو دنیوی قانون کا احترام سکھاتی ہے، کوئی دوسری قوت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی، اجتماعی زندگی اسی سے پھلتی پھولتی ہے، اور انسان کی دماغی اُلجھنیں اسی سے دُور ہوتی ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اجتماعی زندگی کا بہتر ہونا افراد کے اخلاقی اعتبار سے بہتر ہونے پر موقوف ہے۔ جرمن فلسفی کانٹ نے مذہب کے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے کہ دینی معتقدات کے ساتھ ساتھ اُس کی تعلیمات میں کافی حصّہ معیاری اخلاقی تعلیمات کا ہو، ورنہ اس کو مذہب کہنا ہی صحیح نہ ہوگا[1]۔

انسان کے تمام کاموں کا محرک اُس کا عقیدہ یا خیال ہے، اور اس کی نگرانی دنیا کا کوئی قانون نہیں کر سکتا۔ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ اجتماعی اور حکومتی قوانین کی خامیوں سے فائدہ اُٹھا کر سینکڑوں برائیاں اور جرائم کرتے رہتے ہیں، کیونکہ ان کو پورا الیقین ہوتا ہے کہ قانون کی زد سے ہم صاف بچ کر نکل جائیں گے، برخلاف اس کے

---

[1] ملاحظہ ہو تفصیل کے لئے لیکچرس اون اتھکس صفحہ ۷۸ تا ۸۰

Lectures on Ethics By Immanuel Kant, P. 78-80

Translated from the German.

سے پریشان نہیں ہوتا اور خلوص، سچائی اور دیانتداری کا دامن کسی حال میں اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ ایک اچھے سماج کے لئے ہم کو ان تمام صفات کی بہت ضرورت ہے، اور کوئی سمجھدار شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ انسان اچھائی اور برائی، سچ اور جھوٹ، حق اور باطل کے فرق کو خداداد عقل سے پہچانتا ہے اور تمام مقبول مذاہب میں معقول باتوں پر عمل کی ہدایت کی گئی ہے اور نامعقول باتوں سے روکا گیا ہے لیکن انسان جس قدر مذہب سے بیزار ہوتا جا رہا ہے تقویٰ و پرہیزگاری کا خیال مٹ رہا ہے اور برائیاں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ عیش و تنعم، سیر و تفریح کو زندگی کا اصل مقصد قرار دے دیا گیا ہے، اپنے ہی جیسے انسانوں کو حقیر و ذلیل سمجھنا اور ان کو غلام بنا کر حکومت کرنے کا خیال معیوب شمار نہیں کیا جاتا، زیادہ سے زیادہ تباہ کن طاقتوں کا عقلی تدابیر کے ذریعے فراہم کرنا، درندوں اور وحشیوں کی طرح ایک دوسرے پر حملہ کرنا، اور آزادی کا نام لے کر خون بہانا زندگی کا اعلیٰ مقصد سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ تمام باتیں اس جدید تمدن کے اثرات ہیں جو ہر طرح کی رہنمائی کے لئے انسانی عقل کو اور صرف انسانی عقل کو کافی سمجھتا ہے اور مذہب کو ایک بیکار چیز سمجھتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں مذہب کا مقام

کسی زندگی کو صحیح معنی میں اجتماعی جب ہی کہا جائے گا جب مل جل کر ایک ساتھ رہنے والے لوگ تعاون کر رہے ہوں، اور ایک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے ہوں، لیکن اس تعاون کی تکمیل بغیر کسی ایسے قانون کے نہیں ہوسکتی کہ جو لوگوں کو حقوق اور واجبات کی صحیح حدود بتائے، اور لوگ اس کی خلاف ورزی کرنے سے گھبراتے

بعد کو سیاسی دنیا میں بڑا دھوم مچا یا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قانون اس وقت کے تمام قانونوں سے بہتر تھا، اور یورپی تاریخ میں ہم دیکھیں گے کہ اس نے اصلاح میں بہت مدد دی۔ لیکن نہ تو یہ قانون رومیوں کی سیرت کو سدھار سکا اور نہ وہ فلسفہ جو بعد کو یونانیوں سے سیکھا گیا، اور اگر اخلاق اور انسانی ہمدردی کو دیکھا جائے تو رومی ان قوموں سے کہیں بدتر تھے جنھوں نے اس وقت تک تلوار کے زور سے بڑی سلطنتیں قائم کی تھیں۔ رومیوں کا مذہب کوئی تھا ہی نہیں، اُن کی تہذیب بہت اوچھی تھی، بہت ہی بے رحم تھے، اور اپنے غلاموں کے ساتھ جو برتاؤ کرتے تھے، وہ ایشیا کی نسلیں جنھیں یورپی قوموں کے مورّخ کبھی وحشی اور خونخوار کہنے سے نہیں چوکتے، اپنے کتّوں کے ساتھ بھی نہ کرتیں۔ آدمیوں کو آدمیوں سے لڑانے، ان کا خون بہتے، اور ان کو تڑپ تڑپ کے جان دیتے دیکھنے میں روم کے سوا کہیں کے بھی لوگوں کو مزا نہیں آیا۔ اور جب خون کی چاٹ پڑ گئی تو ہتھیار بندوں کی لڑائی سے رومیوں کو تسکین نہ ہوئی، اور وہ درندوں کے سامنے مرد، عورتیں بچّے ڈالنے لگے۔ یہی وہ قوم تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے دنیا کو منظّم سیاسی زندگی اور قانون کی عملداری کا سبق پڑھایا۔[1]

مذکورہ بالا سطور سے انسان کے بنائے ہوئے قانون کی خامی بخوبی ظاہر ہو گئی۔ وجہ ظاہر ہے کہ جس قانون کی پابندی انسان صرف حکومت کے ڈر سے کرتا ہو، اور خدا سے خوف کا خیال تک اُس کے دل میں نہ آئے تو ایسا قانون انسانی زندگی کے تمام گوشوں پر نہ پورے طور پر حاوی ہو سکتا ہے اور نہ مفید۔ جس قسم کے خیالات انسان کے ہوں گے اسی قسم کے کاموں کی طرف اس کی توجہ ہو گی۔ ہر سچّا مذہب یہ سکھاتا ہے

[1] دنیا کی کہانی صفحہ ۶۴-۶۶ (پروفیسر محمد مجیب - جامعہ ملّیہ اسلامیہ دہلی)

جو شخص دینی عقائد کو اپنے کاموں کی بنیاد بناتا ہے وہ یہ چاہتا ہے کہ خود اس کا دل بھی پورے طور پہ مطمئن ہو کہ وہ جو بھلائی کسی کے ساتھ کر رہا ہے اُس میں کسی قسم کا کھوٹ تو نہیں ہے، یا اس کی ذاتی اغراض تو شامل نہیں ہیں۔ اور وہ صرف خدا کی خوشنودی حاصل کرنے یا اس کی ناراضگی سے بچنے کے لئے یہ کام کر رہا ہے۔

رومیوں کے دورِ حکومت کے بعد سینکڑوں برس تک دنیا کی مختلف حکومتیں اُن کے بنائے ہوئے قانونی ڈھانچے کو سامنے رکھ کر اُس سے فائدہ اُٹھاتی رہیں، اور آج بھی دنیا کی متمدّن اور مہذّب ترین اقوام کے دلوں پر اُن کے قانون کا سکّہ بیٹھا ہوا ہے، لیکن خود رومیوں کو اپنے بنائے ہوئے قانون سے کیا فائدہ پہنچا اور ان کی اصلاح کہاں تک ہوئی؟ اس کا حال علمِ تاریخ کے ایک مبصّر سے سنئے۔

"رومیوں میں کام چلاتے رہنے کی ایسی خدا داد قابلیت تھی کہ ہر چند اُن کی ریاست کو شہنشاہوں کے ظلم اور زیادتی اور وحشی نسلوں کے حملوں سے صدمے پہنچتے رہے، ان کی ریاست چار سو برس سے زیادہ قائم رہی، اور ایسا نام چھوڑ گئی کہ لوگ اُسے سینکڑوں برس بعد تک مصیبت کے وقت میں یاد کرتے رہے۔ رومیوں میں یہ صفت بھی تھی کہ وہ قاعدے قانون کو بہت مانتے تھے، اور یہ سمجھ کر کہ تجارت اور دولت کھنچ کر وہیں پہنچ جاتی ہے جہاں لوگوں کو جان اور مال کی سلامتی کا یقین ہو، انھوں نے روم میں پردیسیوں کے لئے ایک عدالت قائم کر لی جس میں رومی جج قوموں کے عام رواج یا اپنی عقل اور انصاف کے خیال کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ انھیں فیصلوں سے آہستہ آہستہ ایک قانون تیار ہوا۔ جیسے شہنشاہیت کے زمانے میں، جب یونانی فلسفے کا چرچا ہوا تو لوگوں نے قانونِ فطرت سمجھ لیا، اور اس طرح ایک اصطلاح رائج ہوئی جس نے

میں کامیابی کا بہت کچھ انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ فوجوں کا اخلاقی معیار بلند ہو، کوئی فوجی سپہ سالار اپنی فوجوں سے فتح اور کامیابی کا اسی وقت متوقع ہو سکتا ہے جبکہ اُن کے ضمیر اپنے اعمال و افعال سے پورے مطمئن ہوں، میں یہ بات پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جو لشکر خدا کی مرضی سے ہٹ کر اپنا راستہ اختیار کرتا ہے وہ سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے؂۱ "

ایک دو نہیں بلکہ بہت سی ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ جن میں یورپ کے مفکّرین نے مذہبی اور روحانی قدروں کا پورا پورا اعتراف کیا ہے، اور اُن کو موجودہ تہذیب و تمدّن کے کھوکھلے ہونے کا احساس ہو چلا ہے۔

۱؎ الدّین صفحہ ۴۔ (ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز مصری)

کہ جہاں تک ممکن ہو انسان اپنے خیالات اچھے اور پاکیزہ رکھے، تاکہ ان اچھے خیالات کا اثر اس کے تمام کاموں پر پڑے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ مذہبی نہیں ہیں وہ اچھائی اور بُرائی میں تمیز نہیں کر سکتے، غیر مذہبی لوگوں کو بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ برائیوں سے بچتے ہیں اور ان کی طبیعت کا جھکاؤ اچھے کاموں کی طرف ہوتا ہے، حالانکہ اُن پر کسی قسم کی نگرانی نہیں ہوتی۔ کہنا یہ ہے کہ اخلاقی قدروں کو تسلیم کرنے اور اُن پر عمل کرنے کی محرک اگر صرف عقل ہو گی تو غلط راستے پر پڑ جانے کا زیادہ اندیشہ ہے، کیونکہ نفسانی خواہشات عقلِ انسانی پر پردہ ڈال دیتی ہیں، لیکن تنہا عقل پر اعتماد کرنے کی بجائے انسان اگر یہ سمجھے کہ ایک ایسی ذات بھی موجود ہے کہ جس کو ظاہر و پوشیدہ کا پورا علم ہو جاتا ہے، انسان کسی جگہ بھی چھپ کر کوئی کام کرے اس کو علم ہو جاتا ہے، اور انسان کی نیت و ارادے کا حال اس پر پوشیدہ نہیں تو یقینی بات ہے کہ اس قسم کے خیالات رکھنے والا شخص غلط راستے پر بہت کم پڑے گا، اور اگر بہ تقاضائے بشریت اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گا تو وہ بہت جلد اشکِ ندامت اور توبہ و استغفار سے اس کے دھبوں کو دھونے کی کوشش کرے گا۔

انسانی معاملات کا قیام عدل و انصاف پر جب ہی ہو سکتا ہے جب کہ دینداری کی روح کارفرما ہو، دنیا کی وہ حکومتیں جو مادیات میں بہت کچھ ترقی کر چکی ہیں، ان کی بے چینی و بے اطمینانی اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ دینی روح کو بیدار کئے بغیر ہر قسم کی ترقی بے سود و بے کار ہے، اور وہاں جان، یورپ کے مفکّرین کو اس کا پورا احساس ہو چلا ہے کہ دینی اور اخلاقی عنصر قوموں کی ترقی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جنرل منٹگمری نے ۴۔ مارچ ۱۹۵۱ء میں اپنی فوج کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا "جنگ

اگرچہ اُن کے طریقوں میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا ہو۔

لغت میں یہ لفظ کتنے معانی میں استعمال کیا گیا ہے، اور عربوں نے اس کو کس کس طرح استعمال کیا ہے؟ اس کی تفصیل یہاں مقصود نہیں ہے، لیکن اُن تمام معانی کو پیشِ نظر رکھ کر جن میں کہ لفظ دین استعمال کیا گیا ہے، نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ دین دو چیزوں کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے جس میں ایک طرف سے اطاعت و عاجزی اور دوسری طرف سے حکم اور اُس کے ماننے کا مطالبہ ہوتا ہے، اور ان باتوں پر بھی دین کا اطلاق ہوتا ہے جو جانبین کے تعلق کو استوار کرنے والی ہوں، یعنی عقائد و اعمال، لیکن لفظ دین کی لغوی تحقیق ہم کو واضح طور پر اُس معنی تک نہیں پہنچاتی جس میں عام طور پر یہ استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ پر بحث کرتے ہوئے اہلِ قلم نے لفظِ دین کی جو تعریف کی ہے اُس کا ذکر کر دیا جائے۔

علمائے اسلام کے نزدیک دین کی مشہور تعریف یہ ہے: "وہ خدائی قانون و دستور کہ جس پر چلنے سے دنیا اور آخرت کی بھلائی نصیب ہو"[1] دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ خدائی قانون جو انسان کو سچے معتقدات کا راستہ اور اصلاح معاملات کا طریقہ بتلائے۔

جرمن فلسفی کانٹ (Kant) نے دین کی تعریف میں کہا ہے "ہم یہ بات مدِّنظر رکھیں کہ ہمارے تمام فرائض و واجبات کا تعلق کسی بالاتر ہستی سے ہے"[2]

فرانسیسی فلاسفر شاشوآں (Chachion) نے دین کی تعریف اس طرح کی ہے "اُس بندھن کو کہا جاتا ہے کہ جو انسان کا رشتہ خدا سے جوڑتا ہو"[3]

---

[1] الدّین صفحہ ۲۶ (ڈاکٹر محمد عبد اللہ دراز مصری) [2] ایضاً صفحہ ۲۷ [3] ایضاً صفحہ ۲۶

اسلام دینِ فطرت ہے

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ (الروم)

تم یکسو ہو کر اپنا رُخ اس دین کی طرف رکھو، اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قابلیت کا اتباع کرو جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس پیدا کی ہوئی چیز کو جس پر اس نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے نہ بدلنا چاہیئے، پس سیدھا دین یہی ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (بیان القرآن)

پہلے مختصر طور پر یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ لفظ "دین" کا کیا مفہوم ہے، جو شخص یہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے دین، عیسائیوں کے دین، یہودیوں کے دین، یا اِن کے علاوہ اور کسی دین کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ لفظ "دین" کا مفہوم اور مطلب سمجھے، اس لئے کہ لفظ دین تمام ادیان کو شامل ہے،

مذکورہ بالا نظریہ کوئی نیا نہیں ہے، آج سے ہزاروں برس پہلے یونان کے عقلمندوں کی ایک جماعت نے بھی اس سے ملتی جلتی باتیں کہی تھیں جن کو اب پھر دُہرایا جا رہا ہے۔

ہزاروں برس پہلے جن لوگوں نے یہ بات کہی تھی اُن پر زیادہ تعجب نہیں کیونکہ اُس زمانے کا انسان اتنا روشن دماغ نہ تھا جتنا کہ آج کا انسان، وہ علمی تحقیقات کے میدان میں موجودہ انسان سے یقیناً پیچھے تھا۔ ہزاروں برس کے پُرانے کھنڈرات تک یہی گواہی دے رہے ہیں کہ متمدن اقوام ہوں یا غیر متمدن وہر زمانے میں انسان دین کی طرف مائل رہا ہے، اور اس کا سبب کوئی خارجی یا عارضی چیز نہیں بلکہ خود انسانی طبیعت میں کسی غیبی طاقت کے پائے جانے کا رجحان ہے، یہ اور بات ہے کہ عقائد اور عبادات کے طریقے مختلف رہے ہوں۔

ماکس میولر (Max Muller.) نے انسان اور دین دونوں کی تاریخ پیدائش ایک ہی بتائی ہے۔

یہ عالم کیا ہے؟ انسان کی تخلیق کیسے ہوئی؟ ان دونوں کو کس نے پیدا کیا؟ ان کے پیدا کرنے اور بنانے سے کیا غرض ہے؟ ان کی ابتدا کیسے اور کس طرح ہوئی؟ زندگی اور موت کیا ہے؟ کیا یہ عالم کبھی فنا ہوگا؟ کیا کوئی ایسا دستور العمل پایا جاتا ہے کہ جس پر عمل کرنا اس دنیوی زندگی میں انسان کے لئے ضروری ہے؟ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہے؟ یہ یا اسی قسم کے اور بہت سے سوالات ہیں کہ جب سے انسان نے خدا کی اس زمین پر قدم رکھا مختلف زمانوں، قوموں اور ملکوں کے لوگوں کے دماغوں میں دین کی طرف فطری رجحان کی وجہ سے آئے، صرف دماغوں میں نہیں آئے، بلکہ ان سوالات نے اُن کو اس درجے پریشان کیا کہ انھوں نے اپنی اپنی عقل و سمجھ کے

ہربرٹ سپنسر Herbert Spencer نے کہا ہے

"دین ایک ایسی طاقت پر ایمان لانے کا نام ہے کہ جس کی ابتدا و انتہا کا زمان و مکان کے اعتبار سے ہم کوئی تصور نہ کرسکیں"[۱]

ماکس میولر (مشہور جرمن مستشرق) Max Muller. نے دین کی تعریف اس طرح کی ہے" ایک ازلی و ابدی ذات کے تصور کی کوشش کرنا جس کو اللہ کہا جاتا ہے جس کا تصور پورے طور پر ممکن نہیں، اور الفاظ اس کی حقیقت بیان کرنے سے قاصر ہیں"[۲]

مذکورہ بالا تعریفات کے علاوہ دین کی اور بہت سی تعریفیں بھی کی گئی ہیں جن کا یہاں نقل کرنا طوالت سے خالی نہ ہوگا، لیکن قریب قریب تمام تعریفوں میں اطاعت و انقیاد کا مفہوم پایا جاتا ہے، اور کسی نہ کسی درجے میں لغوی معنی سے مناسبت موجود ہے۔

لفظ دین کی اس ضروری تشریح کے بعد ہمارا اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ دین یا دینی عقائد کب سے پائے گئے؟

کچھ لوگ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ ہزاروں برس سے انسان خالص مادی زندگی بسر کرتا آرہا ہے، اور کبھی کسی دینی عقیدے کی طرف اس کی توجہ نہیں ہوئی، چند خودغرض لوگوں نے جو زمین و جائداد وغیرہ رکھتے تھے ذاتی اقتدار حاصل کرنے اور اس کو باقی رکھنے کی غرض سے کچھ بیوقوف لوگوں کو الٹی سیدھی باتیں بتا کر اپنے گرد جمع کرلیا تاکہ وہ معتقدین ان کے جان و مال کی حفاظت میں لگے رہیں۔

---

[۱] الدین صفحہ ۲۷ (ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز مصری) [۲] ایضاً صفحہ ۲۷

ممتاز عقل کی وجہ سے جو اس کو عطا کی گئی ہے بہت زیادہ ہیں، رنج و مسرت کا احساس، ہمیشہ زندہ رہنے کی آرزو، کوشش اور کام کا بدلہ چاہنے کی خواہش، اطمینان و سکون سے زندگی گزارنے کی تمنا، عاقبت اندیشی و انجام بینی، شہرت و عزت حاصل کرنے کا والہانہ جذبہ، دولت، مال اور اولاد کی خواہش، نفع حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا۔ کسی بالاتر ہستی اور غیبی طاقت کا خداداد عقل کے ذریعے شعور، نہ صرف شعور بلکہ اپنے خالق کی معرفت کی طلب، اس کی عبادت کا جذبہ، اور اس کی رضامندی کی تڑپ، ابتدائے عالم سے لے کر اب تک نسل انسانی اس مطالبے میں متفق رہی ہے، اور کوئی اختلاف نہیں رکھتی، اس لئے یہ اس کی فطرت کہلائے گی اور اسی فطری آرزو کے تحت ہر زمانے میں انسان مذہب کا متلاشی رہا ہے۔

ہر دور اور ہر زمانے کے انسانوں کا ان خصوصیات میں یکساں طور پر مشترک ہونا کسی ایک ہستی کے پائے جانے کا پتہ دیتا ہے جو انسان اور انسانی فطرت سے خالقیت کا تعلق رکھتی ہے۔

اسی طرف قرآن کریم میں انسان کو ان الفاظ سے متوجہ کیا گیا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (ذاریات)	اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور تمہاری ذات میں بھی تو کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا۔ (بیان القرآن)

اب یہ دیکھنا ہے کہ مظاہر فطرت پر نظر کرنے اور موجوداتِ عالم کے دیکھنے سے انسان کا خیال ایک ایسے خدا کی طرف جو اپنی ذات و صفات میں یکتا ہے کیسے گیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب انسان نے موجوداتِ عالم پر نظر کی تو دیکھا کہ اس دنیا میں

مطابق ان کے اچھے یا بُرے، کمزور یا زور دار حل تلاش کئے، اور جن باتوں کا تعلق عمل سے تھا اُن پر یہ سمجھ کر عمل کیا کہ یہ ہماری پریشانیوں کو دور کرنے والی ہیں۔ اسی کا نام دینی رجحان ہے۔

ہنری برگسون نے کہا ہے "اس قسم کی بہت سی جماعتیں پہلے بھی تھیں اور اب بھی ہیں کہ جن کا درجہ علوم وفنون کے میدان میں صفر کے برابر ہے، لیکن کسی زمانے میں کوئی جماعت دین کے بغیر نہیں پائی گئی"[1]

اس بے دینی اور الحاد کے زمانے میں جب کہ دین و مذہب کے خلاف تمام طاغوتی طاقتیں ہمت کر کے جمع ہو گئی ہیں آج بھی دنیا کی اکثر آبادی کا رجحان کسی نہ کسی دین کی طرف ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ انسانی فطرت میں دین کا تقاضا موجود ہے۔

فطرت کا مطلب

یوں تو حیوانات بھی کچھ نہ کچھ ظاہری و باطنی خصوصیات رکھتے ہیں، جو اُن کی فطرت کہلاتی ہیں۔ لیکن اس کی توضیح مقصود نہیں ہے۔ یہاں صرف فطرتِ انسانی کی تشریح پیشِ نظر ہے۔

انسان میں کچھ ظاہری اور باطنی ایسی خصوصیات ہیں جو بلا امتیاز رنگ و نسل ہر دور اور ہر زمانے میں مشترک طور پر اس میں نظر آتی ہیں، یہی اس کی فطرت کہلاتی ہیں، اس کی ظاہری خصوصیات مثال کے طور پر یہ ہیں، اس کا سیدھا اور صاف قامت، ایک مخصوص انداز کی صورت اور دلکش رنگ، انسان کی باطنی خصوصیات اس کی اس

---

[1] الدین صفحہ ۷، (ڈاکٹر محمد عبداللہ دراز مصری)

کو یہ سمجھانا چاہا کہ ستارے ہوں یا چاند و سورج سب کے سب انسان کے لئے مفید اور کارآمد ہیں، سب انسان کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اور کسی نہ کسی نظام کے پابند ہیں، اگر یہ نظام کے پابند نہیں تو پھر سورج ایک خاص وقت پر کیوں غروب ہوتا ہے، چاند کیوں غائب ہو جاتا ہے، اور ستارے اپنے اپنے وقت اور جگہ پر کیسے نکلتے اور چمکتے ہیں۔ ایسی چیزوں کو پوجنے سے کیا فائدہ کہ جو فنا اور غائب ہو جاتی ہیں، اور ان میں ذرا بھی پائیداری نہیں، جب کسی نہ کسی کو پوجنا ہی ٹھہرا تو ایسی ذات کی پرستش کیوں نہ کی جائے جس نے کائنات اور اس کی تمام چیزوں کو پیدا کیا اور ایک نظام کا پابند بنایا، انھوں نے کہا تم لوگ مظاہر فطرت پر ایمان لانے اور اُن کو پوجنے کی بجائے خالقِ فطرت پر ایمان کیوں نہیں لاتے اور اس کی پرستش کیوں نہیں کرتے؟

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے طریقے پر چلنے والے کو مُسلم کہا گیا ہے، اور ان کے دین کو ایک مستحکم دین بتایا ہے۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ج دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ٥ (الانعام)	آپ کہہ دیجئے کہ مجھکو میرے رب نے ایک سیدھا راستہ بتا دیا ہے کہ وہ ایک دین ہے مستحکم جو طریقہ ہے ابراہیم کا جس میں ذرا کجی نہیں اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے۔ (بیان القرآن)

دینِ فطرت نیا دین نہیں ہے

اور یہ دینِ اسلام کوئی نیا دین نہیں ہے، اس کے بنیادی اصول میں آدم علیہ السلام سے لے کر آخری پیغمبر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں اُن میں کچھ ایسا نظام ہے کہ وہ خود بخود نہیں پا یا جا سکتا، وہ موجود ہونے کے بعد نشو ونما پاتی ہیں، اور ان میں خاص خاص تاثیریں، قوتیں اور صلاحیتیں ہوتی ہیں، یہ چیزیں کیسے موجود ہیں ؟ کس نے ان کو پیدا کیا ؟ ان کا قائم رکھنے والا اور نگہبان کون ہے ؟ اور ان میں یہ خاصیتیں اور صلاحیتیں کس نے رکھی ہیں ؟ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد اس کا خیال کسی بالا تر ہستی اور طاقت کی طرف گیا ۔ اسلام کو دینِ فطرت اس لحاظ سے کہنا بھی صحیح ہوگا کہ قوانینِ فطرت کے علم ہی نے انسان کے خیال کو ایک خالق کی طرف رجوع کیا، اور نظامِ عالم کے اس سلسلے نے جو نہایت مضبوطی کے ساتھ کائنات کو جکڑے ہوئے ہے، انسان کو توحید کا پرستار بنایا، جو لوگ ظاہر بیں تھے، لیکن فطرتاً دل ان کا بھی کسی کو پوجنے کے لئے بیتاب تھا، وہ مظاہرِ فطرت میں اُلجھ کر رہ گئے ، اور جمادات، نباتات، حیوانات، چاند، سورج، دریاؤں وغیرہ کو جن سے کہ وہ فائدے حاصل کرتے تھے، اپنا دیوتا مان کر اُن کی پرستش میں لگ گئے، اور جن لوگوں نے یہ سمجھا کہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہوگی جس نے ان تمام مظاہرِ فطرت کو پیدا کیا، اور ان کو کسی نہ کسی نظام کا پابند بنایا، وہ خالقِ کائنات کے پرستار کہلائے ۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا درسِ توحید

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب آنکھ کھولی تو اپنے گھر میں اور گھر سے باہر لوگوں کو بتوں اور مظاہرِ فطرت کی پرستش کرتا ہوا پایا، اُن کے زمانے میں ستاروں کو پوجنے والے لوگ زیادہ تھے ۔حضرت ابراہیمؑ نے بڑے اچھے ڈھنگ سے اپنی قوم

کہلائے، اسی طرح دینِ حنیف کے اندر اگر فروعی اختلافات پائے جائیں تو اس کی وحدت میں بھی کوئی فرق نہیں آسکتا۔

یہ کہنا کہ اسلام کی ابتدا آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی، نہ صرف تاریخ ادیان کے اعتبار سے غلط اور بالکل غلط ہوگا، بلکہ اسلام کو دینِ فطرت کہنے کا دعویٰ ہی غلط ہوجائے گا۔

قرآنِ کریم میں ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (آلِ عمران)	بلاشبہ دین (فطرت) اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔

دینِ فطرت کی پہچان

جو سوالات فطری طور پر انسان کے دل و دماغ میں آتے ہیں، جو ان سوالات کا کافی وشافی جواب دے وہ دینِ فطرت ہے، جس دین کی تعلیمات میں سے کوئی ایک چیز بھی فطرتِ انسانی سے نہ ٹکرائے اور اس کو قبول کرنے کو تیار ہو جائے اُس کو دینِ فطرت کہا جائے گا۔ اسلام دینِ فطرت ہے، کیونکہ اس نے فطری سوالات کو بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا ہے، اور انسان کو قوانینِ فطرت، علم و حکمت، عقلی دلائل اور آزاد فکر و ضمیر کی روشنی میں اپنی تعلیمات پر غور کرنے اور اُن کو پرکھنے کی پوری پوری اجازت دی ہے۔

اسلام سے پہلے انسان پر ایک ایسا دور گزر چکا ہے کہ وہ دین کو ایسی باتوں کا مجموعہ سمجھتا تھا کہ جن کا سمجھنا انسانی عقل سے بالاتر ہے، جن کی اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ

لیکن اُمتوں کے حالات چونکہ مختلف تھے، اس لئے شریعتوں میں اختلاف کا ہونا ضروری تھا، اگر اصول و کلیات میں اتحاد ہو تو قرآن کریم فروعی اختلافات کے باوجود اس کو اختلاف نہیں کہتا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۝ (الشّوریٰ)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے واسطے وہی دین مقرر کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا، اور جس کو ہم نے آپ کے پاس وحی کے ذریعے سے بھیجا ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم کیا تھا کہ اسی دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا۔ (بیان القرآن)

میکس میولر نے اسلام کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے "جہاں تک اسلام کے مرکزی عقائد کا تعلق ہے ان کا سرچشمہ ابراہیم (علیہ السّلام) کا دین ہے جو ایک سچے خدا کے دوست اور اس کے پرستار تھے۔"[1]

اس میں شک نہیں کہ حضرت نوح علیہ السّلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے زمانے تک شریعتوں کا اختلاف رہا۔ مگر اس کے باوجود قرآن کریم نے سب کو ایک ہی دین قرار دیا ہے اور شریعتوں کے فروعی اختلاف کو وحدتِ دین کے منافی نہیں سمجھا، اگر فروعی اختلاف کو بھی حقیقی اختلاف سمجھا جاتا تو اس افتراق کے ہوتے ہوئے "وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ" (دین میں افتراق نہ پھیلاؤ) کہنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے، اور جس طرح آسمانی شریعتیں اور صحفِ انبیاء علیہم السلام فروعی اختلافات کے باوجود ایک ہی دین

---

[1] انٹروڈکشن ٹو دی سائنس آف ریلیجن صفحہ ۵۴ Introduction to the Seience of Religion By Max Muller P. 54

۲ ۔ انسان کائنات کی اکثر و بیشتر چیزوں سے فائدہ اُٹھا رہا ہے، اور ان کو اپنے کام میں لگائے ہوئے ہے، اُس کا خیال ہے کہ کائنات کی ہر چیز کسی نہ کسی غرض و مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے تو وہ خود بھی کسی نہ کسی غرض و مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہوگا ۔ اور وہ غرض کیا ہے؟

۳ ۔ اس پر ہر وقت کوئی نہ کوئی فکر سوار رہتی ہے، خصوصاً موت کا خیال اس کو بہت ستاتا ہے، اور ایسی تدبیریں سوچتا رہتا ہے کہ وہ کبھی نہ مرے ۔ کیا ہمیشہ زندہ رہنے کی اُس کی یہ فطری خواہش کسی طرح سے پوری ہو سکتی ہے؟

۴ ۔ کیا موجودات صرف ان ہی چیزوں کا نام ہے کہ جو اس کو عقل و حواس کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہیں یا کچھ ایسی چیزیں بھی موجود ہیں کہ جن کو وہ ان ذرائع سے نہیں جان سکتا؟

۵ ۔ انسان فطرتاً حرص و طمع کا دلدادہ ہے، روزمرہ کے واقعات بتلاتے ہیں کہ اس کی آرزوئیں اور تمنائیں کسی حد پر جاکر نہیں ٹھہرتیں، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس تھوڑی سی عمر میں اس کی کبھی ختم نہ ہونے والی تمناؤں اور آرزوؤں کی تکمیل نہیں ہو سکتی، کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ جس کے ذریعے اس کی یاس کو آس میں تبدیل کیا جاسکے!

یہ وہ سوالات ہیں کہ جو بلاتخصیص مذہب و ملت ہر سلیم العقل انسان کے دل و دماغ میں چکر لگاتے رہتے ہیں، اور یہی سوالات مذہب کو ابدیت بخشتے ہیں ۔ علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب "الکلام" میں ایک فرانسیسی پروفیسر کی کتاب سے ایک بڑا اچھا جملہ نقل کیا ہے، پروفیسر نے لکھا ہے "مذہب ابدی چیز ہے، کیونکہ مذہب جس

انسان ان کے ذریعے سے اپنی فطرت کے تقاضوں کو اتنا کمزور کردے اور اپنے نفس کی خواہشات کا سخت مقابلہ کرکے اس کو اتنا دبا دے کہ خواہشات کا سلسلہ ہی ختم ہوجائے۔ مذہبی رہنماؤں اور دینی پیشواؤں کی اندھی تقلید بھی عبادت سمجھی جاتی تھی، لوگوں کا خیال تھا کہ مذہبی پیشوا جو کچھ بتائیں بغیر کسی حجت کے مان لینا چاہیئے، کیونکہ کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے، یہی نجات کا زینہ ہے، اور ان کی مخالفت ہر قسم کی تباہی و بربادی کی جڑ ہے۔

ظاہر ہے کہ جب انسان کے خیالات اس درجے پست ہو جائیں تو وہ اپنے بلند ترین مرتبے سے گر کر جانوروں کی صف میں آجائے گا، اور اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی غلامی کے سینکڑوں پٹے اس کی گردن میں پڑ جائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عام طور سے دین کا یہی غلط اور غیر فطری مفہوم سمجھا جارہا تھا۔ سنت اللہ کے مطابق کسی ایسے شخص کی ضرورت تھی کہ جو ایسی تعلیمات لے کر آئے جو ان غیر فطری اور انسانیت کو پستی کی طرف لے جانے والی رسموں کو یکسر ختم کرکے لوگوں کو ایسی باتیں بتائے جو ان کی فطرت کے موافق ہوں۔ پیغمبر اسلام کا ایسے وقت میں مبعوث ہونا کہ جب غلط اور گمراہ کن باتوں کے ذریعے انسانی فطرت کو دبایا جارہا ہو اسلام کے دینِ فطرت ہونے کی دلیلوں میں سے ایک دلیل ہے۔

اب رہی یہ بات کہ وہ کون سے سوالات ہیں کہ جو فطری طور پر انسانی دماغ میں آتے رہتے ہیں؟ اسی مضمون کی ابتداء میں ان باتوں اور سوالات کا ذکر آچکا ہے لیکن کسی قدر اضافہ و تبدیلی کے ساتھ ان کا یہاں دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس عالم کی ابتداء کیسے ہوئی؟ اور اس کا کیا انجام ہوگا؟

تک محدود ہے یا ان چیزوں تک کہ جو تجربے میں آسکیں، لیکن جو چیزیں احساس، مشاہدہ اور تجربے کے دائرے سے خارج اور بالاتر ہیں سائنس والوں نے بیکار اپنے آپ کو ان میں اُلجھایا۔ مادّیت کے خوفناک دلدل میں پھنسے ہوئے لوگوں کے لئے روحانی دنیا اور انسان کی روحانی لذّت کے جو سامان اس میں ہوں گے اُن کا سمجھنا بہت مشکل ہے، یہ سعادت تو صرف مذہب کو حاصل ہے کہ وہ ایک ایسے عالم سے باخبر کرتا ہے جس میں انسان کو ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے اور فطری سوالات کی پوری گتھی کو انسانی نفسیات کی روشنی میں سلجھا کر رکھ دیتا ہے، سائنس نے اختراعات و ایجادات کے میدان میں عقل کو حیران کر دینے والے کرشمے دکھائے، سبب اور اثر کا تعلق سمجھایا، نیچر کی عظیم الشان قوتوں کا انکشاف کیا، اور یہ سب صرف اس لئے کہ انسان یہ چند روزہ زندگی راحت و آرام سے گزارے، اور اپنی ضروریات زندگی کے فراہم کرنے میں کوئی دقّت و دشواری محسوس نہ کرے، سانس کے بند ہوتے ہی جس عالم سے واسطہ پڑتا ہے اس کے متعلق علم سائنس کچھ نہیں بتا سکتا، وہ ایسی دنیا کے تصوّر ہی سے گھبراتا ہے کہ جہاں انسان کو مرنے کے بعد جانا ہے، برخلاف اس کے دینِ فطرت جس طرح کہ انسان کی رہنمائی دنیا کی زندگی میں کرتا ہے اسی طرح دوسری دنیا یا عالمِ آخرت کے لئے بھی انسانوں کو بہت کچھ بتاتا ہے، دینِ فطرت یہ بتاتا ہے کہ دوسرے عالم میں جانے کے لئے کس توشہ اور سامان کی ضرورت ہے؟ وہاں کن کن دشواریوں کا سامنا ہوگا اور کن کن منزلوں سے گزرنا ہوگا؟ کس کس بات اور کس کس کام کی پوچھ ہوگی؟ جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ سائنس کے نظریات تو آئے دن بدلتے رہتے ہیں، اگر بہت کوشش کرکے وہ ان باتوں میں سے کسی بات کا

سوال کا جواب ہے وہ کسی زمانے میں کبھی معدوم نہیں ہو سکتا۔

کچھ لوگ تو ان سوالات کو وہم اور وسوسے کی پیداوار سمجھ کر اُن کی طرف توجہ نہیں کرتے، یا دنیا کے بکھیڑے اُن کو اتنی مہلت ہی نہیں دیتے کہ وہ کچھ سوچیں، لیکن زیادہ تر لوگ اپنی دماغی اور روحانی تسکین کے لئے ان کا صحیح جواب چاہتے اور اس کے لئے سرگرداں رہتے ہیں، اور یہ کسی کے بس کی بات نہیں ہے کہ اس قسم کے خیالات و سوالات اس کے دماغ میں نہ آئیں۔ رینان نے اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے؛

"یہ ممکن ہے کہ وہ اشیاء جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں، اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محسوب ہیں مٹ جائیں، لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے[1]"

یعنی ناممکن ہے کہ انسان جانوروں کی طرح اپنے ماضی اور مستقبل کے متعلق سوچنا چھوڑ دے۔ دوسری جگہ رینان نے کہا ہے:۔

"مذہب ہمیشہ علانیہ اس کا ثبوت دے گا کہ وہ خیالات قطعاً غلط ہیں جن میں چاہا جاتا ہے کہ انسان کی دماغی قوّت اسی پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے[2]"

عالم کے آغاز و انجام کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے مادّے کی بحث میں پڑنا اور اس فرسودہ بحث کو دوبارہ زندہ کر کے مردہ کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی طرف تو اب سائنس کی توجہ بھی نہیں ہے، ماہرینِ سائنس کے نزدیک بھی اب مادّہ ابدی موت سو گیا ہے، اس کو جگانا جب وہ خود مناسب نہیں سمجھتے تو ہم کیوں جگائیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ لوگ ان گتھیوں کے سلجھانے کے قصے میں پڑے کیوں؟ یہ تو اُن کا کام ہی نہ تھا، کیوں کہ سائنس کی بحث و تحقیق کا میدان واقعات اور مشاہدات

---

[1] الدین القیّم صفحہ ۵۵ (مولانا سید مناظر احسن گیلانی) [2] ایضاً صفحہ ۵۶

کرکے اُن کی روشنی میں اس دنیوی زندگی کو گزار دینا چاہیئے، جب مذہب کی تعلیمات پر عمل کرنے سے دُنیا کا کوئی کام نہیں بگڑتا ہے تو بلاوجہ خطرہ کیوں مول لیا جائے ۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کے آغاز و انجام کے متعلق فطری سوال کا دینِ فطرت یا دینِ اسلام نے کیا حل پیش کیا ہے، کیونکہ اس سلسلہ کے بقیہ سوالات کا حل اس کے حل ہو جانے کے بعد آسان ہو جائے گا۔

دینِ فطرت نے اس گتھی کو سلجھانے کے لئے عقل و حواس اور فلسفیانہ باتوں پر غیر معمولی بھروسہ کرکے اس کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی، بلکہ ان معمولی ذرائع کے بجائے ایک نئے ذریعے کا سہارا لے کر جس کا نام مذہبی زبان میں وحی اور نبوت ہے اس گتھی کو سلجھایا، وحی اور نبوت کو نیا ذریعہ مادّی علوم کے اعتبار سے کہا گیا ہے، ورنہ حقیقتہً یہی سب سے پُرانا ذریعہ ہے، آسمانی مذاہب کی تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی وحی اور نبوت کی مشعل ہاتھ میں لے کر ان سوالات پر غور کیا گیا، انسانی بستیوں میں ہل چل مچ گئی، قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کی جبروتی طاقتوں کو سرِتسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ مادّی علوم و فنون کے کمزور ناخن ان فطری سوالات کی گرہ نہیں کھول سکتے، اس قسم کی گرہوں کے کھولنے کے لئے اور ہی قسم کے ناخن ہوتے ہیں، اور جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے انسانی فطرت نے عقل و حواس کی بے بسی کا پورا اندازہ کرکے اسی راہ کو اختیار کیا اور پریشان دماغوں کے لئے اطمینان و سکون کا سامان فراہم کیا۔ اب رہی یہ بات کہ نبوّت و رسالت کی کیا حقیقت ہے؟ اس کو آئندہ صفحات میں مستقل عنوان کے تحت مفصّل بیان کیا جائے گا، یہاں تو صرف اتنا بتانا ہے کہ انسانوں ہی میں سے کچھ لوگ ایک خاص قوّت کے مالک ہوتے ہیں جس کے

جواب دے بھی تو اس پر کون یقین کرے گا، ہو سکتا ہے کہ آیندہ کے تجربات اور حالات اس نظریے ہی کو غلط ثابت کر دیں کہ جس کو بنیاد مان کر وہ جواب دیا گیا تھا، لیکن دینِ فطرت نے ہم کو زندگی کے جو اصول پیغمبروں کے ذریعے آسمانی کتابوں کے توسل سے بتائے ہیں ان میں تبدیلی اس لئے ممکن نہیں کہ بنانے والے نے ان کو رہتی دنیا تک کے لئے بنایا تھا، البتہ فروعی احکام میں مختلف زمانوں کی ضروریات کا لحاظ رکھتے ہوئے تھوڑی سی لچک ضرور رکھ دی ہے۔

عقل حیران ہے کہ مادیت کے پجاری دین کے معاملے میں دور اندیشی سے کیوں کام نہیں لیتے، انھوں نے کن دلائل کی بنا پر اس بات کا یقین کر لیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کو کوئی دشوار گزار مرحلہ طے نہیں کرنا ہے۔ بس اسی زندگی کا کھٹکا تھا، جب وہ ختم ہو گئی تو سارا قصہ ہی ختم ہو گیا، ایک عقلمند شخص اس طفل تسلی پر مطمئن نہیں ہو سکتا، اس کے دماغ میں رہ رہ کر یہ سوال ضرور چکر لگائے گا کہ اگر مرنے کے بعد کوئی اور منزل نہیں ہے تو خیر کوئی بات نہیں، لیکن جیسا کہ مذہب کہتا ہے، اگر کچھ باز پرس ہوئی اور وہاں ایک نیا عالم نظر آیا تو اس وقت کیا ہو گا؟ اور اس حساب و کتاب سے کیسے چھٹکارا ہو گا کیا وہاں یہ کہہ کر چھٹکارا ہو جائے گا کہ ہماری عقل میں چونکہ اس عالم آخرت کا کوئی تصور ہی نہ تھا اس لئے ہم نے اس کا انکار کر دیا تھا، اور اس کے لئے کسی قسم کی تیاری نہ کی تھی، محض قانون سے ناواقفیت یا اس کو ناقابلِ اعتبار سمجھ کر اگر کوئی جرم کیا تھا تو دنیا کی کوئی عدالت بھی اس قسم کے عذروں کو معقول سمجھ کر مجرم کو سزا دئے بغیر نہیں چھوڑتی ہے، تو مذہب کے بارے میں اس قسم کے عذر کب قابلِ سماعت ہوں گے معمولی سمجھ کا انسان بھی یہی کہے گا کہ احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ مذہب کے اصول تسلیم

بعد یہ بتایا کہ اس کا پیدا کرنے والا کون ہے اور اس کی صفات کیا کیا ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ یہ عالم اور اس کی تمام چیزیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں، انھوں نے سوتے ہوئے انسانوں کو جگا جگا کر یہ کہا کہ تمھارے پیدا کئے جانے سے خالقِ عالم کا یہ مقصد ہے اور اس کائنات میں قدم رکھنے کے بعد یہ یہ فرائض تم پر عائد ہوتے ہیں، انھوں نے انسانوں کو یہ جتلا اور بتلا دیا کہ انسان کے ہر چھوٹے اور بڑے، اچھے اور بُرے عمل کا حساب ہوگا، اور اسی کے مطابق جزا و سزا ملے گی، اور جنّت، دوزخ، فرشتوں اور لوحِ محفوظ کے موجود ہونے کی خبر دی، انھوں نے یہ بھی کہا کہ انسان مرتا ہے تو اس کی روح فنا نہیں ہوتی۔

اس عالم کے آغاز کی کیفیت، اللہ تعالیٰ کا وجود، عالم ارواح کی چیزوں کی تفصیل، مرنے کے بعد کے حالات اور حساب وکتاب، یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ جن کو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے بتایا، اور ان تمام باتوں کے متعلق تمام پیغمبروں کی تعلیمات قریب قریب یکساں ہیں، طرزِ بیان اور اجمال و تفصیل کا فرق تو حالات کے لحاظ سے ہو ہی جاتا ہے، اصول میں اختلاف نہیں ہے، اور سچّے لوگوں کی خبروں میں کہ جن کا سرچشمہ ایک ہی ہو، اختلاف ہو کیسے سکتا ہے، دینِ فطرت کا انسانوں سے یہ مطالبہ ہے کہ ان باتوں کو مانو، کیونکہ یہ ماننے کی ہیں، اس نے ان باتوں اور چیزوں کے جاننے اور محسوس کرنے کا تو مطالبہ ہی نہیں کیا، لوگوں نے یہ کہہ کر ہم ان چیزوں کو نہ جانتے ہیں اور نہ محسوس کرتے ہیں، پھر پرانی بات کو دھرایا اور عقل و حواس کو دخل دینا چاہا، نتیجے کے طور پر ناکامی اور مایوسی سامنے آئی۔ اسلام یا دینِ فطرت کی طرف سے ان چیزوں کے ماننے کا مطالبہ خود بتا رہا ہے کہ ان کے ماننے کی صلاحیت

ذریعے ان کی رسائی کائنات کے ابتدائی سرچشمے تک ہوجاتی ہے، اور وہ ان تمام باتوں کو اچھی طرح سے جان لیتے ہیں جن کو عام انسان براہِ راست اپنی عقل وحواس سے نہیں جان سکتے۔

عقلِ انسانی کی بے بسی کا بار بار تذکرہ کرنے سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ عقل کوئی کام ہی کی چیز نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی بات تو کوئی بے عقل ہی کہہ سکتا ہے، انسان کو عقل ایک ایسی نعمت عطا ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہے جانے کا مستحق ہوا، اور مادّی دنیا میں بہت کچھ ترقی اسی عقل کی بدولت ہورہی ہے، لیکن انسان اور انسانیت کا اصلی شرف اور کمال ان روحانی تعلیمات کے قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے پر موقوف ہے، جو وحی اور نبوّت کے راستے سے بھیجی جاتی ہیں، اس عالم کے آغاز کرنے والے نے جب سے اس کا آغاز کیا ہے نبوّت اور وحی کے ذریعے انسان کی تعلیم و ہدایت کا سلسلہ بھی جاری کر دیا ہے، یہ کیسے ممکن تھا کہ پیاس تو پیدا کی جاتی اور پانی پیدا نہ کیا جاتا؟ قانونِ فطرت کے خلاف کوئی بات ہو کیسے سکتی ہے، پیغمبر اس نئے ذریعے سے ان حقیقتوں کو بتاتے ہیں جو عقل کے ذریعے معلوم نہیں ہوسکتیں، اس کا یہ مطلب نہ سمجھ لیا جائے کہ پیغمبروں کی تعلیمات خلاف عقل ہوتی ہیں، خلافِ عقل نہیں ہوتیں بلکہ عام عقلِ انسانی کی ان تک رسائی براہِ راست نہیں ہوتی، اور نہ انسان صحیح طور پر ان کو اپنی عقل کے کانٹے پر تول سکتا ہے، پیغمبر یہ بتاتے ہیں کہ موجودات صرف ان ہی کو نہیں کہا جاتا جن کو کہ انسان عقل و حواس کے ذریعے جان اور دیکھ لے، اس ذریعے سے تو انسان بہت کم چیزوں کو سمجھتا اور محسوس کرسکتا ہے، انھوں نے کائنات کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے

عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ
أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ كَمَا
تُنْتَجُ الْبَهِيمَةُ بَهِيمَةً جَمْعَاءَ هَلْ
تُحِسُّونَ فِيهَا مِنْ جَدْعَاءَ ثُمَّ
يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ وَاقْرَءُوا إِنْ
شِئْتُمْ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ
عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَلِكَ
الدِّينُ الْقَيِّمُ - (رواہ الاربعہ)

پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی
بنا لیتے ہیں، جیسا کہ چوپائے صحیح و سالم بچہ جنتے ہیں
کیا تم اس میں کان کٹا دیکھتے ہو، اس کے بعد حضرت
ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو اس کی تصدیق
قرآن کریم میں پڑھ لو، یہ خدا کی فطرت ہے جس پر
اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اس کی فطرت میں
کوئی تبدیلی ممکن نہیں، دینِ قیم (صحیح دین) یہی ہے۔

محمد اسد نے اپنی کتاب "اسلام ایٹ دی کراس روڈس Islam at the Cross-roads" میں لکھا ہے کہ والدین سے مراد صرف ماں باپ ہی نہیں بلکہ انسان کا ماحول مراد ہے جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔[1]

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے صاحب ترجمان السنۃ نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے۔

"اللہ تعالیٰ نے ہر ہر نوع کے لئے کچھ ظاہری و باطنی خصوصیات علیحدہ مقرر فرمائی ہیں جن کی وجہ سے ان انواع میں باہمی امتیاز قائم ہے، مثلاً طیور کے لئے پر، پنجے، چونچ، چوپایوں کے لئے جسم پر بال، ایک بچھا ہوا قامت، اور ایک مخصوص انداز کے پاؤں، پھر ہر نوع کے لئے مخصوص رنگ، جدا جدا مقدار و صورت مقرر کی ہے۔

---

[1] اسلام ایٹ دی کرس روڈس صفحہ ،، Islam at the Cross-roads
By Muhammad Asad P. 77 مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء پانچواں ایڈیشن

انسانی طبیعت و فطرت میں موجود ہے ورنہ مطالبہ ہی کیوں کیا جاتا۔ لیکن ماحول چونکہ اثر کئے بغیر نہیں رہتا، اس لئے وہ ماحول کہ جو دینِ فطرت کے خلاف ہوتا ہے فطری رجحان کو بہت کچھ کمزور کر دیتا اور کبھی کبھی تو اس کو بالکل ہی دبا دیتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے "حجتہ اللہ البالغہ" میں ان چیزوں کو مفصّل بیان کیا ہے، جو انسانی فطرت پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور جن کی وجہ سے اکثر اوقات فطرت کا اثر ظاہر نہیں ہونے پاتا۔

اگر کسی انسان کے بچّے کا بھیڑیئے کے بھٹ میں پلنے کے بعد اپنے ہی جیسے انسان کو دیکھ کر بھیڑیئے کی طرح حملہ کرنا ممکن ہے، اور کسی درندے کی درندگی کا انسانوں کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے کم ہو جانا یا بالکل جاتا رہنا ممکن ہے تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ کسی انسان کے بچّے کو اگر پیدا ہونے کے بعد ہی بے دینی کا ماحول مل جائے تو دین کی طرف جو اس کا فطری رجحان ہوتا ہے وہ کمزور ہو جائے یا اس کو دینی احساس باقی ہی نہ رہے، پھر اگر پیغمبرِ اسلام نے یہ بات کہہ دی کہ انسان کا بچّہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن ماحول کے اثر سے اُس کا وہ فطری تقاضہ ابھر نہیں پاتا، تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے، انھوں نے وہی تو فرمایا کہ جس کا اعتراف ماہرِ نفسیات بھی کرتے ہیں۔

حدیثِ فطرت

حدیث میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مَّوْلُوْدٍ یُوْلَدُ	حضرت ابو ہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ہر بچہ اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر

عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ	پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی
أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ كَمَا	بنا لیتے ہیں، جیسا کہ چوپائے صحیح و سالم بچہ جنتے ہیں
تُنْتَجُ الْبَهِيمَةُ بَهِيمَةً جَمْعَاءَ هَلْ	کیا تم اس میں کان کٹا دیکھتے ہو، اس کے بعد حضرت
تُحِسُّونَ فِيهَا مِنْ جَدْعَاءَ ثُمَّ	ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو اس کی تصدیق
يَقُولُ أَبُو هُرَيْرَةَ وَاقْرَؤُوا إِنْ	قرآن کریم میں پڑھ لو، یہ خدا کی فطرت ہے جس پر
شِئْتُمْ فِطْرَتَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ	اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، اُس کی فطرت میں
عَلَيْهَا لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللهِ ذَالِكَ	کوئی تبدیلی ممکن نہیں، دین قیم (صحیح دین) یہی ہے۔
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ۔ (رواہ الاربعہ)	

محمد اسد نے اپنی کتاب " اسلام ایٹ دی کراس روڈس Islam at the Cross-roads میں لکھا ہے کہ والدین سے مراد صرف ماں باپ ہی نہیں بلکہ انسان کا ماحول مراد ہے جس سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔[1]

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے صاحب ترجمان السُّنّۃ نے شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتاب "حجۃ اللہ البالغۃ" سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے۔

" اللہ تعالیٰ نے ہر ہر نوع کے لئے کچھ ظاہری و باطنی خصوصیات علیحدہ مقرر فرمائی ہیں جن کی وجہ سے ان انواع میں باہمی امتیاز قائم ہے، مثلاً طیور کے لئے پر، پنجے، چونچ، چوپایوں کے لئے جسم پر بال، ایک بچھا ہوا قامت، اور ایک مخصوص انداز کے پاؤں، پھر ہر نوع کے لئے مخصوص رنگ، جدا جدا مقدار و صورت مقرر کی ہے۔

---

[1] اسلام ایٹ دی کرس روڈس صفحہ ۷۷ Islam at the Cross-roads By Muhammad Asad P. 77 مطبوعہ لاہور ۱۹۶۱ء پانچواں ایڈیشن

انسانی طبیعت و فطرت میں موجود ہے ورنہ مطالبہ ہی کیوں کیا جاتا۔ لیکن ماحول چونکہ اثر کئے بغیر نہیں رہتا، اس لئے وہ ماحول کہ جو دینِ فطرت کے خلاف ہوتا ہے فطری رجحان کو بہت کچھ کمزور کر دیتا اور کبھی کبھی تو اس کو بالکل ہی دبا دیتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ دہلوی نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں ان چیزوں کو مفصّل بیان کیا ہے، جو انسانی فطرت پر پردہ ڈال دیتی ہیں اور جن کی وجہ سے اکثر اوقات فطرت کا اثر ظاہر نہیں ہونے پاتا۔

اگر کسی انسان کے بچے کا بھیڑیئے کے بھٹ میں پلنے کے بعد اپنے ہی جیسے انسان کو دیکھ کر بھیڑیئے کی طرح حملہ کرنا ممکن ہے، اور کسی درندے کی درندگی کا انسانوں کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے کم ہو جانا یا بالکل جاتا رہنا ممکن ہے تو یہ کیوں ممکن نہیں کہ کسی انسان کے بچے کو اگر پیدا ہونے کے بعد ہی بے دینی کا ماحول مل جائے تو دین کی طرف جو اس کا فطری رجحان ہوتا ہے وہ کمزور ہو جائے یا اس کو دینی احساس باقی ہی نہ رہے، پھر اگر پیغمبرِ اسلام نے یہ بات کہہ دی کہ انسان کا بچّہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن ماحول کے اثر سے اُس کا وہ فطری تقاضہ ابھر نہیں پاتا، تو اس میں کون سی تعجب کی بات ہے، انھوں نے وہی تو فرمایا کہ جس کا اعتراف ماہرِ نفسیات بھی کرتے ہیں۔

حدیثِ فطرت

حدیث میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ	حضرت ابو ہریرہؓ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ ہر بچّہ اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر

فطرت کہا جائے گا، جیسا کہ بھوک لگنا، مذکر کا مؤنث کی طرف میلان، اسبابِ زینت سے اپنے نفس کو آراستہ کرنا، یہ انسان کی فطرت ہے، مگر جب یہودیت و نصرانیت کا بھوت اس کی فطرت کو مسخ کر دیتا ہے تو رہبانیت کی زندگی محبوب نظر آنے لگتی ہے، گرسنگی اور عزوبت (نکاح نہ کرنا) کی زندگی مرغوب بن جاتی ہے، یہ فطرت نہیں خلافِ فطرت ہے۔ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ کی یہی شرح سمجھنا چاہئیے۔[۵]

اِس باب کی ابتدا میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے، اور اس نے انسان کو قوانینِ فطرت، علم و حکمت، عقلی دلائل اور آزاد فکر کی روشنی میں اپنی تعلیمات پر غور کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے، لیکن یہ تو صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اس کو ثابت کرنے کے لئے مختصر طور پر چند شواہد کا ذکر کیا جائے۔

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ دینِ فطرت کے پہچاننے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ اس کی کوئی تعلیم بھی انسانی فطرت سے نہ ٹکرائے، اور انسان کی سادہ فطرت اس کی تعلیمات کو ماننے کے لئے تیار ہو جائے، اور یہ کسوٹی کسی مذہب کی تعلیمات کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے بہت کافی ہے، میرا تو یہ خیال ہے کہ جس قدر مذہب اسلام میں مظاہرِ فطرت پر غور کرنے اور اس کے نتیجے کے طور پر کسی صانع اور خالق کے موجود ہونے پر زور دیا گیا ہے، کسی اور مذاہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی، جیسا کہ آئندہ صفحات میں "وجودِ باری تعالیٰ" کی بحث میں توضیح کی جائے گی کہ قرآن کریم نے خالق کے وجود پر کوئی ایسی منطقی دلیل قائم نہیں کی ہے کہ جس میں مقدمات اور مسلّمات سے کام لیا گیا ہو بلکہ بڑے سادے انداز میں مظاہرِ فطرت کو وجودِ خالق کی دلیل بنایا گیا ہے۔

---

۵ ترجمان السنّۃ صفحہ ۲۷۶ (مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی) مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔

یہ تو ان کی ظاہری خصوصیات ہوئیں، اب اسی طرح ان کی کچھ باطنی خصوصیات بھی ہیں۔ مثلاً شہد کی مکھی کا مخصوص پھولوں سے عرق نکال کر کیمیائی طریق پر شہد تیار کرنا، بعض پرندوں کا اس نزاکت سے گھونسلہ بنانا کہ عقلِ انسانی بھی دیکھ کر انگشت بدنداں رہ جائے، جب سے عالم پیدا ہوا ہے شہد کی مکھی سے لے کر ایک ہاتھی تک اپنی ظاہری و باطنی خصوصیات کے ساتھ پیدا ہوتے چلے آئے ہیں، اس لئے یہ خصوصیات اُن کی فطرت کہلاتی ہیں۔

اب حضرتِ انسان پر ذرا غور کیجئے، اس میں بھی نوعی طور پر کچھ ظاہری و باطنی خصوصیات ہیں، جو ان ہی خصوصیات کو لئے ہوئے ہر دور میں مشترک طور پر نظر آتی ہیں، یہی اس کی فطرت کہلاتی ہیں۔ مثلاً اس کی ظاہری خصوصیات یہ ہیں کہ اس کے جسم پر نہ پرندوں کے سے پَر ہیں نہ حیوانات کے سے بال، ایک مخصوص انداز کا سیدھا اور صاف قامت ہے، ایک مخصوص قسم کا دلکش رنگ اور ایک مخصوص انداز کی دلربا صورت، اس کی باطنی خصوصیات، اس کی عقل، وہ عقل ہے جس میں اپنے خالق کی معرفت کی طلب، اس کی عبادت کا جذبہ، اس کی رضامندی کی تڑپ ہے۔ پیدائشِ عالم سے لے کر اگر نوعِ انسانی پر غور کروگے تو جس طرح دیگر حیوانات اپنے ان باطنی خصوصیات میں متفق نظر آتے ہیں اسی طرح نسلِ انسانی اس مطالبے میں اختلاف نہیں رکھتی، اس لئے یہ اس کی فطرت کہلانا چاہیئے۔ جمہورِ عالم کو مذہبی تلاش اسی فطری آرزو کے ماتحت ہے، ہاں کبھی بیرونی اسباب اور اس کے ماحول کے اثرات اُسے اتنا متأثر کر دیتے ہیں کہ اس میں خالق کی تلاش نہیں رہتی، اور اگر رہتی بھی ہے تو طبیعت غلط راستے کی طرف بھٹکنے لگتی ہے، مگر ان اثرات کو فطرت نہیں کہا جاسکتا، خلاف

اور دنیا کی کوئی طاقت اُس کو بچانے والی نظر نہیں آتی اُس وقت اُس کا دل کسی ایسی غیبی قوت وطاقت کی طرف کھنچتا ہے جو اس کو ہلاکت سے بچائے۔ یہی ہے وہ شعور اور پوشیدہ احساس جو دینِ فطرت کے تمام عقائد و اعمال کی بنیاد ہے، دینِ فطرت یا دینِ اسلام کا تصوّر بغیر خدا کے وجود کے ہو ہی نہیں سکتا، لوگوں کا یہ کہنا کہ اگر فطرت کے قاعدوں پر چلنا ہی دین و مذہب کی اصل ہے تو پھر آسمانی کتابوں کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے' اس غلط خیال پر مبنی ہے کہ وہ دینِ فطرت کا یہ مطلب سمجھ رہے ہیں کہ انسان اپنی عقل اور سمجھ کی روشنی میں ان پر غیر معمولی اعتماد کر کے اپنی طبیعت کی خواہشات پر عمل کرے، اور کسی دوسرے کی تعلیم و تلقین کو گوارا نہ کرے، دینِ فطرت کا یہ غلط تصوّر یقیناً لوگوں کو بے دینی، دہریت اور لاقانونیت کی طرف لے جانے والا ہے اور لے جا رہا ہے، آخرت اور عاقبت کی درستی تو بڑی بات ہے ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ رہنا مشکل ہو جائے گا۔

دینِ فطرت کا صحیح تصوّر

دینِ فطرت کا صحیح تصوّر یہ ہے کہ ایک خدا کو پہچان کر اس کی ہدایات کے مطابق اپنی فطری صلاحیتوں کو کام میں لگایا جائے۔ رہی یہ بات کہ ہم خدا کی ہدایات کو کس طرح معلوم کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس خالق نے انسان کی ہر جسمانی ضرورت کے پورا کرنے کا سامان بہم پہنچایا ہے وہ انسان کی روحانی ضروریات میں کیسے اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا، اور اُن کو پورا نہ کرتا، بتایا جا چکا ہے کہ ایک نئے ذریعے سے جس کو وحی اور نبوّت کہا جاتا ہے انسان کی دستگیری کی گئی، اور اس کی روحانی تشنگی کو

مشہور فلاسفر ولیم جمیس نے ان ہی غیر فطری دلائل کی بھرمار سے اُکتا کر یہ کہہ دیا تھا "وہ بڑے بڑے دفتر جن میں خدا کو ثابت کیا جاتا تھا، اور جو ایک صدی پہلے یقینی سمجھے جاتے تھے، آج وہ سب ایسے حقیر ہوگئے ہیں کہ کتب خانوں میں بجائے اُن کے خاک بھر دی جائے تو بہتر ہے"۔[1]

یہ سادہ انسانی فطرت اور طبیعت ہی تو ہے کہ جو انسان کو (فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتی ہے، جب وہ اس کائنات پر نظر ڈالتا اور اس کے تعجب میں ڈالنے والے نظام پر غور کرتا ہے تو اس کو چار و نا چار یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان تمام ظاہری اسباب و وسائل اور قوتوں کے اوپر ایک ایسی قوت ضرور موجود ہے، جس کی قدرت اور عظمت کے سامنے یہ سب سرنگوں ہیں، وہی زمین، آسمان، چاند، سورج اور ستاروں کا مالک و خالق ہے، اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، اگر ہوا سے ایک پتّہ بھی ہلتا ہے تو اس کو علم ہو جاتا ہے، اور انسان کے دل میں جو خیال بھی آتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس کی خبر ہو جاتی ہے۔

انسان کبھی کبھی اپنے آپ کو مصیبتوں میں اس قدر گھرا ہوا پاتا ہے کہ اُن سے نکلنے کی کوئی دنیوی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، ایک مصیبت سے پیچھا نہیں چھوٹنے پاتا کہ دوسری سر پر منڈلانے لگتی ہے، اس حیرانی اور مایوسی کے عالم میں اس کا دل بے اختیار ایک اَن دیکھی طاقت کی طرف جھک جاتا ہے، یکایک مصیبتوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں، اور تمام ظاہری اسباب اُس کی نظر میں مکڑی کے جالے سے زیادہ کمزور نظر آنے لگتے ہیں۔ جب انسان کشتی پر سوار ہوتا ہے اور وہ طوفان میں پھنس جاتی ہے

---

[1] الدین القیم صفحہ ۸۰ (مولانا گیلانیؒ)

یوں تو عقل حیوانات بھی رکھتے ہیں، اور اسی کے ذریعے وہ اپنے نفع اور نقصان کو سمجھتے ہیں، لیکن جانوروں کی عقل اور انسانوں کی عقل میں فرق یہ ہے کہ جانور انسان کی طرح چند مقدمات کو رکھ کر اُن سے دور رس نتائج نہیں نکال سکتا، اور کمالات کے اُن اونچے مراتب تک بھی نہیں پہنچ سکتا جہاں تک کہ انسان کا ایک بچہ پہنچ جاتا ہے، انسان کا ایک چھوٹا سا بچہ بھی مظاہر فطرت کو دیکھ کر کسی ہستی کا متلاشی نظر آتا ہے، ان چھوٹے بچوں کے کہ جن کی فطرت کو خراب ماحول نے گرد آلود نہ کر دیا ہو، چاند، سورج اور ستاروں وغیرہ کے متعلق عجیب وغریب سوالات اس بات پر گواہی دیتے ہیں۔

قرآن کریم نے بھی انسان کو مظاہر فطرت پر غور کرکے کسی ہستی کا پتہ لگانے کی دعوت دی ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ٥ (البقرة)	بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں، اور جہازوں میں جو کہ سمندر میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں لے کر، اور پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا، پھر اس سے زمین کو تر و تازہ کیا اس کے خشک ہوئے پیچھے اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے، اور ہواؤں کے بدلنے میں، اور ابر میں جو زمین و آسمان کے درمیان مقیّد رہتا ہے، دلائل ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔ (بیان القرآن)

بچایا گیا، اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اس لئے بھیجے کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ کن باتوں کو اللہ پسند کرتا ہے اور کن کو ناپسند۔

جس دین کے بغیر انسانی فطرت کی تکمیل نہ ہوتی ہو اُس کا وجود نوعِ انسانی کے لئے اتنا ہی ضروری ہوگا جتنا کہ افرادِ انسانی کے لئے عقل کا ہونا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے لئے دینِ فطرت کی حفاظت کا وعدہ فرما لیا ہے۔ انسان اللہ تعالیٰ کا شاہکار ہے، خالقِ انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شاہکار ابتدا، آفرینش سے لے کر قیامت تک دینِ فطرت کی تعلیمات سے آراستہ و پیراستہ رہے، اسی مقصد کی تکمیل کے لئے اُس نے فرشتوں کو نہیں بلکہ ایسے انسانوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا جو بہترین نمونۂ عمل تھے، تاکہ وہ انسانی فطرت کو نکھارتے رہیں، اور یہ بھی تو قانونِ فطرت ہی ہے کہ ہر چیز کی ترقی کی ایک حد ہوتی ہے، اور ایک خاص حد پر پہنچنے کے بعد اس کی ترقی رُک جاتی ہے، انسان، حیوان، درخت، چاند، سورج، وغیرہ آہستہ آہستہ بڑھتے اور ایک خاص حد پر پہنچ کر رُک جاتے ہیں۔ اس قانونِ فطرت سے دینِ فطرت کیسے مستثنیٰ ہو سکتا تھا، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ کر اس کی تکمیل بھی ہوگئی، اور قیامت تک آنے والے انسان اس کی تعلیمات سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میری اُمت میں ایک جماعت دین پر ہمیشہ ہمیشہ ثابت قدم رہے گی، اور مخالفین اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔"

دینِ فطرت اور عقل

انسان کو دوسری مخلوقات پر جو شرف حاصل ہے وہ عقل کی وجہ سے ہے،

بھی ہوتے ہیں کہ اُن کو نہ تو علوم عقلیہ سے مناسبت ہوتی ہے، نہ کسی عقل والے کی رہنمائی اُن کو حاصل ہوتی ہے، اور نہ کوئی کتابی دلیل رکھتے ہیں، لیکن پھر بھی خدا کے بارے میں کٹ حجتی کرتے ہیں۔ ایک معمولی عقل والا بھی سمجھتا ہے کہ کسی موضوع پر بحث کرنے کے لئے عقل اور علم دونوں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ علم خواہ کسی راہبر کے ذریعے ہو، یا کسی کتاب کے ذریعے ہو یا کسی اور ذریعے سے، اس کا ہونا بہرحال ضروری ہے، اور اگر علم کے تمام ذرائع مفقود ہیں تو کم از کم خود اس شخص میں اتنی عقل ہونا چاہئے کہ جس کی مدد سے وہ کسی چیز کے متعلق تھوڑا بہت تو جان سکے۔

اسلام یا دینِ فطرت نے علم اور علماء کی فضیلت بیان کی، اور انسان کو تحصیلِ علم کے لئے اُبھارا، کیونکہ علم عقل کے زنگ کو دور کرتا ہے، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے پیشِ نظر دینِ فطرت کی یہی تعلیمات تھیں کہ جنھوں نے ان کو علومِ جدیدہ کی طرف توجہ دلائی اور وہ بہت سے علوم وفنون میں یورپ کے استاد بنے، قرآن کریم نے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے جو باتیں بتائی تھیں اور کہنے والوں نے اُن کے خلاف بہت کچھ کہا بھی، لیکن آج وہ حقیقت بن کر سامنے آرہی ہیں، اور سائنس داں بھی اس کا اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ باتیں بالکل ٹھیک ہیں۔

قرآن کریم میں ہے۔

سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ (یٰسٓ)	وہ پاک ذات ہے جس نے تمام متقابل قسموں کو پیدا کیا، نباتاتِ زمین کے قبیل سے بھی اور ان آدمیوں سے بھی اور ان چیزوں میں بھی جن کو لوگ نہیں جانتے۔ (بیان القرآن)

علامہ سید رشید رضا مصری نے لکھا ہے" لفظ عقل اور اس کے مشتقات قرآن مجید میں قریب قریب پچاس جگہ استعمال کئے گئے ہیں، اسی طرح عقلمندوں کا ذکر قرآن کریم کی بہت سی آیات میں کیا گیا ہے[1]"

کائنات پر غور کرنے کی دعوت قرآن کریم نے ان الفاظ میں دی ہے۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى (الروم)	کیا انھوں نے اپنے دلوں میں یہ غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کسی حکمت ہی سے اور ایک میعاد معین کے لئے پیدا کیا ہے۔ (بیان القرآن)

انسان جب عقل سے کام لیتا ہے تو اُس کو ایسی بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جن سے وہ نئے نئے علوم اور ایجادات کا راستہ پالیتا ہے، دین فطرت نے علم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا، کسی معمولی سی چیز کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ پہلے انسان کو اس کے متعلق تھوڑا بہت علم ضرور ہو، ورنہ حقیقت کی جستجو عبث ہوگی۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ (الحج)	اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں بے جانے بوجھے اکسی دلیل اور روشن کتاب کے بغیر جھگڑا کرتے ہیں۔

یہاں علم سے مراد علم عقلی اور نظری ہے، کیونکہ اسی آیت میں هُدًى اور كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ کے الفاظ موجود ہیں۔ آیت کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے

---

[1] الوحی المحمدی صفحہ ۲۱۱ (مطبوعہ مصر) تالیف علامہ سید رشید رضا مصری

پروفیسر محمد مجیب مسلمانوں کی سیاست اور علمی میدان میں ان کی ترقیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

"اسلام نے دین اور دنیا، عبادت اور عادت کو اس طرح شیر و شکر کر دیا کہ اسلام کی تاریخ مسلمانوں کی تاریخ سے الگ نہیں کی جا سکتی، اسلام یا مسلمانوں کا نام لیجئے تو ملک گیری کے حوصلے، علمی خدمات، تجارت اور تہذیب، قانون اور اخلاق، غرض زندگی کا ہر پہلو اور ترقی کا ہر میدان نظر کے سامنے آ جاتا ہے، غیر مسلموں کو یہ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کو دنیا اور تاریخ کی آلائشوں سے پاک کرنا نہیں چاہتے۔ بعض مسلمان اس پر شرماتے ہیں کہ اُن کی ہر لڑائی جہاد اور ہر سیاسی کارروائی شرعی مسئلہ مانی گئی ہے۔ لیکن جہاں اسلام کی تعلیم ہے کہ دین اور دنیا، روح اور جسم، اخلاق اور تہذیب جدا نہیں، نہ کئے جا سکتے ہیں، وہاں دوسری طرف خود تاریخ کو دیکھئے تو وہ آدمی اور آدمیت کی کہانی ہے۔ روحانیت کا کرشمہ نہیں، دنیا کی حقیقتوں سے بیزار ہو کر فلسفے اور خالص روحانیت میں منہ چھپانا درحقیقت ساری انسانی تاریخ کو بے معنی اور بے مصرف ٹھہرانا ہے"[1]

دینِ فطرت میں آزادیٔ ضمیر

اسلام انسان کو قلب و ضمیر کی آزادی بخشتا ہے اور اس کی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی انسان جو خود کو مسلمان کہتا ہو، کسی موقعے پر اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کہے یا کوئی کام کرے، خواہ اس کو کیسی ہی مصیبتوں اور پریشانیوں کا مقابلہ کیوں نہ

---

[1] دنیا کی کہانی صفحہ ۱۲۳ - ۱۲۴

اوپر لکھی ہوئی آیت اور اس کا ترجمہ لکھنے کے بعد پکتھال "دی کلچرل سائڈ آف اسلام" The Cultural Side of Islam میں لکھتے ہیں:" سائنس کی جدید ترین تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہر چیز کا جوڑا یعنی نر و مادہ ہوتے ہیں، یہاں تک کہ چٹان کے پتھروں اور برقی قوت میں بھی" قرآن کریم کی اسی آیت میں یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ بہت سی ایسی چیزیں ہیں کہ جن کے جوڑے اور مقابل موجود ہیں لیکن لوگوں کو ابھی تک وہ چیزیں معلوم نہیں ہو سکی ہیں، یعنی لوگوں کو چاہیئے کہ اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں برابر غور کرتے رہیں، تاکہ وہ فطرت کے پوشیدہ راز کو سمجھنے کے قابل ہو جائیں، اور جب وہ اس قابل ہو جائیں گے تو ان کے لئے خالق فطرت کا سمجھنا آسان ہو جائے گا، انسان علوم و فنون کے ذریعے جس قدر زیادہ مظاہر فطرت کو سمجھے گا، اس پر دینِ فطرت کی حقیقت آشکارا ہوتی جائے گی۔

پکتھال نے اپنے ایک لیکچر میں وہ تمام علوم گنائے ہیں جن کے موجد مسلمان ہیں، یا ان کی ترقی میں مسلمانوں کا بہت بڑا حصّہ ہے، قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے قرآن کریم کی اسپرٹ کو صحیح طور پر سمجھا اور روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ مادّی اور دنیاوی ترقی میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے، اور خلافتِ ارضی کے مستحق قرار پائے۔

لے دی کلچرل سائڈ آف اسلام صفحہ ۶۸ The Cultural Side of Islam P. 68 نوٹ۔ محمد مارماڈیوک پکتھال نے مدراس میں ۱۹۲۷ء کے ماہ جنوری میں "اسلام کے ثقافتی پہلو" پر روشنی ڈالتے ہوئے آٹھ لیکچر انگریزی میں دئے تھے جو کتابی شکل میں شائع کر دئے گئے، یہ بڑا مفید اور قیمتی مجموعہ ہے۔

کی پابندی کے لئے ہو تو اس سے زیادہ احمقانہ فعل اور کیا ہوسکتا ہے، قرآن کریم نے بتایا کہ باپ دادا کا ہر کام اس لئے سند نہیں بن سکتا کہ وہ بھی تم جیسے انسان تھے، ان سے بھی غلطی ہوسکتی ہے، جس قسم کی غلطی تم کر رہے ہو ہوسکتا ہے کہ انھوں نے بھی کی ہو۔

دینِ فطرت سے گریز کا طریقہ مشرکینِ مکہ نے یہی کہہ کر تو نکالا تھا کہ ہم کو اس نئے دین پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ ہمارے پاس تو خود اپنے باپ دادا کے زمانے سے بڑے پختہ اصول موجود ہیں، اور ہمارے لئے وہی کافی ہیں، آج بھی دینِ فطرت کی تعلیمات زندہ ہوتے ہوئے بہت سے ازمس (Isms) نکل رہے ہیں، اور سب کی غرض یہ ہے کہ انسان کی پریشانیوں اور اس کے دُکھ درد کا علاج کریں، اور عجب تماشا ہے کہ دینِ فطرت کے اصول سے ہٹ کر جتنی تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں سب کی سب ناکام ثابت ہو رہی ہیں۔ اگر لوگ چاہتے تو دینِ فطرت کے پرکھنے کا یہ بہت اچھا موقع تھا کہ اس میں اتنی لچک موجود ہے یا نہیں کہ وہ ہر زمانے کا ساتھ دے سکے، لیکن کسوٹی پر پرکھنے سے پہلے ہی یہ کہہ دیا گیا کہ یہ تعلیمات ایک خاص زمانے تک ضرور کام دے سکتی تھیں، اب حالات بدل چکے ہیں، اس لئے ان پر عمل کوئی مفید نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔

محمد مارماڈیوک پکتھال نے بڑی اچھی بات کہی۔

"اسلام ایک مکمل سیاسی اور سماجی نظام پیش کرتا ہے، اور اس کی تعلیمات تمام اُن ازمس (Isms) کا صحیح بدل ہوسکتی ہیں جن کے پیدا ہونے کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری ہے، اسلام کے نظام کو دوسرے نئے نظاموں پر یہ فوقیت ہے کہ وہ جانچا، پرکھا اور برتا ہوا ہے۔"[1]

[1] (لہ حاشیہ صفحہ ۷۶ پر دیکھئے)

کرنا پڑے، ایسا مذہب عقلِ انسانی کو کیوں کر پابند کرسکتا تھا کہ دین کے معاملے میں اس سے بالکل کام نہ لیا جائے۔

اسلام ایسے دلوں کا طلبگار ہے جن میں نرمی اور مروّت ہو، جن میں خدا کا خوف ہو۔ جو برائیوں سے پاک وصاف اور تعصّب و تنگ نظری سے دور ہوں، جو شریفانہ آزادی کے ساتھ ہر معاملے پر غور کرسکیں، اور اندھی تقلید کی غلامی سے آزاد ہوں، اس لئے کہ متعصّب، سخت، غلامی پسند اور جامد دلوں میں دینِ فطرت کے اصول نہیں سما سکتے، انسان کے لئے یہ بہت بڑی مصیبت ہے کہ وہ اپنی عقل و سمجھ سے کام لینا چھوڑ دے، بے سوچے سمجھے اس روش کا پابند ہو جائے جس پر اور لوگ چل رہے ہوں، اور دوسرے لوگوں کے رسم و رواج کو ہی اپنے عمل کی دلیل بنا لے۔ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ حدود ہوتی ہیں، جس طرح عقل سے اتنا کام لینا کہ جتنا وہ نہیں کرسکتی، اور اس پر اتنا غیر معمولی اعتماد کرنا جس کی کہ وہ اہل نہیں، بُرا ہے۔ اسی طرح اس سے بالکل کام نہ لینا اور اندھی تقلید کرنا بھی بُرا ہے۔ قرآن کریم نے ایسی کورانہ تقلید کی سخت مذمّت کی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ (البقرة)	اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو حکم اللہ نے بھیجا ہے اُس پر چلو، تو کہتے ہیں ہم تو اُسی پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، کیا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھ رکھتے ہوں اور نہ ہدایت رکھتے ہوں۔

باپ، دادا اور بزرگوں کی پیروی اگر بے سوچے سمجھے اور صرف رسم و رواج

وہ لوگ کہ جو نسلاً بعد نسل مسلمان چلے آ رہے ہیں، اور
ہیں داخل ہو چکے ہیں، اُن کو تو دینِ فطرت کی تعلیما
چاہیئے تھا، لیکن مشاہدہ اس کے خلاف ہے، مسلمان دی
سمجھ کر اس سے بیگانہ ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور مسلمانوں میں
کی تعلیمات پر عمل کرتے بھی ہیں اُن کے کردار پر دینی تعلیمات کا جو صحیح ا
تھا وہ نہیں پایا جاتا یا اتنا کم اثر ہے کہ جو نہ ہونے کے برابر ہے، اپنوں اور
کی نظر میں اُن کی اور ان کے دین کی کوئی عزت و وقعت نہیں، اس کی کیا وجہ ہے
یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ تمام تمام عمر قرآن کریم کی تلاوت کرتے، نمازیں پڑھتے،
روزوں پر روزے رکھتے، ایک دو نہیں کئی کئی حج کرتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں، مگر
ان عبادات کے اثرات سے اُن کی زندگی یکسر خالی ہوتی ہے، یہ ایک ایسا سوال
ہے جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کی زندگی پر دینِ اسلام یا دینِ فطرت کی تعلیمات کے اثر انداز نہ
ہونے کے مختلف اسباب ہیں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ لوگوں نے اسلام کو بھی دوسرے
مذاہب کی طرح چند رسموں اور عبادتوں کا مجموعہ سمجھ لیا ہے، اور اس بات کے
سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ اسلام کا وہ مرکزی اور بنیادی عقیدہ کیا ہے جو
تمام اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور جس کی پختگی کے بغیر تمام عبادات ظاہری بن کر
رہ جاتی ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ قرآن کریم جو کہ اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ ہے اور
جو اپنی زبان، اندازِ بیان اور اپنے گہرے مطالب کے اعتبار سے اپنی نظیر آپ ہے،
اس کو نمازوں میں اور نماز سے باہر معانی و مطالب پر غور کئے اور سمجھے بغیر پڑھا جاتا ہے،

بے لفظ
کاٹ دیے
"
سے

لوگ اسلامی تعلیمات کو صرف عبادات تک محدود رکھتے ہیں، معاملات اور آپس کے رہن سہن کے متعلق جو اسلامی تعلیمات ہیں اُن کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انسان کو دوسرے لوگوں سے جو واسطہ پڑتا ہے، اس کے لئے معاملات کے اصول کا بیان کرنا ضروری تھا، اور ان کو دینِ فطرت نے بیان کر دیا، لیکن اس سے زیادہ اہم یہ تھا کہ ہر شخص اور ہر فرد کے فطری جذبات و احساسات کی صحیح تربیت کی جائے، اس لئے کہ اچھے افراد سے مل کر ہی اچھا سماج بن سکتا ہے، انسان میں اُنس و محبّت کا جذبہ بھی ہے، اور بغض و عداوت کا بھی، فرماں برداری کا جذبہ بھی ہے اور فرماں روائی کا بھی، اس کی طبیعت میں غصّہ بھی ہے اور رحم و کرم بھی، حرص بھی ہے اور قناعت بھی، ان کے علاوہ اور دوسرے جذبات بھی ہیں کہ جن کی صحیح تربیت بہت ضروری ہے، جس دین میں فنائے جذبات کی تعلیم ہو اُس کو دینِ فطرت کہنا اس لئے صحیح نہ ہوگا کہ اس میں تو فطری جذبات کے فنا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، دینِ فطرت اسی دین کو کہا جا سکتا ہے کہ جس میں ان جذبات کی صحیح تربیت کا سامان کیا گیا ہو، صرف اسلام کی تعلیمات میں نہیں بلکہ پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں بھی دینِ اسلام کے دینِ فطرت ہونے کا عملی ثبوت دیا گیا ہے۔

اس موقع پر ایک بات جو اکثر لوگوں کے دلوں میں کھٹکتی ہے اس کا بیان کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب دینِ فطرت کو قبول کرنے کی صلاحیت انسانی فطرت میں رکھ دی گئی ہے، اور اس کی تعلیم تمام پیغمبر نسلِ انسانی کو دیتے چلے آئے ہیں، تو ایسے دین کی تعلیمات کو تو ہر شخص کو قبول کرنا چاہیئے تھا، خاص طور سے

لے (متعلق صفحہ ۷۵) دی کلچرل سائڈ آف اسلام صفحہ ۱۹ The Cultural Side of Isiam P. 19

کی کیا قیمت ہو سکتی ہے کہ جس کو طرفین میں سے ایک تو سمجھ رہا ہو اور دوسرا ان الفاظ کے معانی سے کہ جن کے ذریعے سے وعدہ یا معاہدہ کر رہا ہے قطعاً ناواقف ہے، کسی نے رٹا دئیے ہیں، اور ان کو دوہرا رہا ہے۔ اس کو تو صحیح معنی میں معاہدہ کہنا ہی صحیح نہ ہوگا، نماز کو تو مثال کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے، قریب قریب تمام عبادات کی یہی حالت ہے کہ ان کو رسماً، عادتاً اور تقلیداً کیا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں جبکہ مذہب کو ہم نے چند رسموں اور عبادتوں کا مجموعہ سمجھ کر اس کی اندھی تقلید شروع کر دی ہے، اور قرآن کریم کو تمام عمر پڑھنے کے بعد ایک مرتبہ بھی ہم اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ اس کے معانی و مطالب کیا ہیں، تو اگر ہمارے عقائد کمزور، دل پریشان، عبادات بے اثر، اور ہم ذلیل و خوار ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور اس کے ذمہ دار خود ہم ہوں گے نہ کہ اسلامی تعلیمات اور دینِ اسلام۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی نظریے یا اصول کی سچائی اور کسی طریقۂ کار کی صحت کا اندازہ اس کے نتیجے سے ہوتا ہے، صدیوں کے تجربے اور عمل کے بعد اگر ہمارا طرزِ زندگی صحیح نتائج برآمد نہیں کرتا، اور قرآن کریم کے وعدے کے باوجود ہم کوئی برتری حاصل نہ کر سکے، تو ماننا پڑے گا کہ یا تو وہ اصول اور نظام ہی صحیح نہیں ہے یا ہم نے اس نظام پر صحیح طریقے سے عمل نہیں کیا ہے۔ قرآن کریم کا بہت سرسری مطالعہ بتلا دے گا کہ ہمارا طریقِ زندگی اس کی تعلیمات کے مطابق نہیں ہے۔ قرآن میں بیشک کہا گیا ہے کہ "اگر تم مومن ہو تو برتر رہو گے" لیکن کیا ہم قرآن کے مطابق چل کر اپنے آپ کو مومن بنا رہے ہیں؟ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی ہمارے اسلاف نے اپنے آپ کو مومن بنایا تو وعدہ بھی پورا کیا گیا۔ قرآن کریم پر شک و شبہ کی بجائے

الغرض قرآن کریم میں ایک دو جگہ نہیں بلکہ متعدد جگہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ اس کتاب کے بہتر فائدہ اُٹھانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو سمجھ کر اور اس کے مطالب و معانی پر غور کر کے پڑھا جائے اور سمجھنے کے بعد اس پر عمل کیا جائے۔ ہم پوری نماز پڑھ جائیں، اور ایک لفظ کا مطلب بھی نہ سمجھیں کہ ہم نے کیا کہا ہے، کس کام کے کرنے اور کس کے نہ کرنے کا ہم نے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کیا ہے، جو مشکلات دینی اور دنیوی معاملات میں ہم کو پیش آرہی ہیں، اُن کے حل کرنے کے لئے ہم نے کس ڈھنگ سے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگی ہے یا مانگنا چاہیئے، اللہ تعالیٰ کی برتری اور اس کے کارساز ہونے کا اقرار ہم نے کن الفاظ کے ذریعے کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسی نماز اپنے پڑھنے والے کے کردار پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتی۔ جب یہی خبر نہ ہو کہ نماز پڑھنے والے نے اللہ تعالیٰ سے کیا عہد کیا ہے، تو پھر اس کو پورا کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسا شخص روزمرّہ کے کاموں میں اپنے مذہبی عقائد و افکار سے کیا کام لے سکتا ہے، اور کس طرح ان کی اصلاح کر سکتا ہے۔ روشن خیال لوگ فوراً یہ کہدیں گے کہ اگر نماز پڑھنے والا ان الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتا تو اس میں حرج ہی کیا ہے، اللہ تعالیٰ تو سمجھتا ہے کہ اُس کے بندے نے کیا کہا؟ بیشک اللہ تعالیٰ سمجھتا ہے، لیکن جو شخص کہ ایک لفظ کا مطلب بھی نہیں سمجھ رہا ہے وہ ان الفاظ کے ادا کرتے وقت خود کیا اثر لے گا؟ اور کس اثر کی روشنی میں اپنے صبح سے لے کر شام تک کے کاموں کو انجام دے گا؟ اس کو جب یہی معلوم نہیں ہے کہ پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے بھی اللہ سے مدد چاہی جاسکتی ہے تو وہ خدا سے کیوں مدد مانگنے لگا! وہ تو اپنے ہی جیسے انسانوں کو سب کچھ سمجھ کر اُن سے مدد چاہے گا، کسی ایسے معاہدے یا وعدے

آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان مخلوق سے بالکل قطع تعلق کر کے چوبیس گھنٹے خدا کی یاد میں لگا رہے، اور دنیا کے کسی کام سے بھی واسطہ نہ رکھے، مخلوق سے تعلقات رکھنے پر تو انسان مجبور ہے، اور اسلام میں ایسی عبادت کا مرتبہ بھی زیادہ ہے کہ جس میں انسان اپنے دنیا کے معاملات کو درست رکھتے ہوئے دین کے فرائض ادا کرنے میں کوتاہی نہ کرے، اور یادِ خدا سے غافل نہ ہو، آیت کا مطلب یہ ہے کہ غیر اللہ کا تعلق اور دنیوی کاموں کی مصروفیت اس کے خیال کو ایک آن کے لئے بھی اللہ کی طرف سے نہ ہٹنے دے، وہ اپنے تمام کاموں میں اللہ کی خوشنودی کو پیشِ نظر رکھے، اور اُس کے حکم کے خلاف کوئی کام نہ کرے، ہر کام کے کرنے سے پہلے یہ سوچ لے کہ کہیں یہ کام اللہ کی مرضی کے خلاف تو نہیں ہے، انسان کا مقصدِ حیات صرف یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے حکم، اس کی مرضی، اور اس کی پسند کے سوا کسی دوسرے کی مرضی، کسی دوسری مصلحت، ضرورت، اور کسی کی خوشی یا ناخوشی کی پرواہ نہ کی جائے۔ اور ہر وقت دل و دماغ پر یہ خیال مسلّط رہے کہ ہمارا اصل تعلق اللہ کے سوا کسی سے نہیں ہے، اور دوسرے تمام تعلّقات اسی کی مرضی کے تحت اور اسی کو خوش رکھنے کے لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اس قسم کا لگاؤ اور عقیدۂ توحید کا دل سے اقرار، دینِ فطرت کا مطالبہ اور اُس کے تمام عقائد، افکار و عبادات کا سرچشمہ اور دینی تعلیمات کی روح ہے، اور اس کے بغیر تمام عبادات ظاہری بن کر رہ جاتی ہیں۔

اپنے اعمال پر توجہ کرنا اور اُن کی اصلاح کی کوشش زیادہ بہتر ہوگا۔ قرآن کریم نے تو عرب جیسی اُجڈ قوم پر اپنا تجربہ کامیاب کر کے دکھا دیا، اور ایسا دکھایا کہ مخالفین اسلام بھی جب تاریخ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اُن کی گردنیں نیچی ہو جاتی ہیں، قرآن اور پیغمبر اسلام کی تعلیمات کی جامعیت اور کاملیت ان کو تسلیم کرتے ہی بن پڑتی ہے، اور شاید یہی راز تھا عرب میں آپ کی بعثت کا، کہ جب قرآنی تعلیمات اور اُسوۂ حسنہ کے اثر سے یہ قوم درست ہو سکتی ہے تو پھر دنیا کی ہر قوم خواہ وہ کیسی ہی پست حالت میں کیوں نہ ہو قرآن کی تعلیمات اور ارشادات نبوی پر عمل کرنے سے بڑی آسانی سے دنیا اور آخرت کی منزلیں کامیابی کے ساتھ طے کرتی چلی جائے گی۔ قرآن کریم نے عربوں کے بنیادی عقائد درست کرنے کے لئے اُن کے دل و دماغ میں خدا کی عبدیت کا صحیح مفہوم بٹھا دیا۔ وہ عرب جو غلامی کے رواج کی وجہ سے غلامی کا پورا تجربہ رکھتے تھے، بڑی آسانی سے سمجھ گئے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اللہ کی غلامی کیسے کرنا چاہیئے، اور انھوں نے اللہ کی غلامی کر کے دکھادی۔

آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ کلمۂ طیبّہ کا صحیح مفہوم لوگوں کے دل و دماغ میں بٹھایا جائے، اسلامی توحید کا تفصیلی ذکر تو آئندہ صفحات میں آئے گا، لیکن لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اجمالی مفہوم یہاں بھی سمجھ لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ وہ یہ کہ پہلے ہم دنیوی و دینی جسمانی و روحانی جملہ تعلقات، اثرات، اور اختیارات کی غیر اللہ سے نفی کر دیں، اس کے بعد ایک خدا کو تسلیم کرتے ہوئے اور اس پر پورا پورا الیقین رکھتے ہوئے ہر قسم کا تعلق اُس کی ذات سے قائم کرلیں۔ قرآن کریم میں ہے

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ (المزمل)	اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اُسی کی طرف متوجہ رہو۔ (بیان القرآن)

تھا کہ جو انسان نجات کے بلند مرتبے حاصل کرنا چاہتا ہو، اُس کے لئے ضروری ہے کہ دنیا اور دُنیا کی تمام چیزوں کو چھوڑ دے، ان کا خیال یہ تھا کہ دنیوی زندگی میں دلچسپی لینے والا آخرت کے اونچے مدارج حاصل نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم نے اس قسم کی مذہبی زندگی کے لئے "رہبانیت" کا لفظ استعمال کیا ہے، اور بتایا ہے کہ کچھ لوگ بلا وجہ خود کو ایسی غیر ضروری پابندیوں میں جکڑ لیتے ہیں جو خدا کی طرف سے ان پر لازم نہیں کی گئی تھیں۔ انسان اور اس کی فطرت کے خالق کو یہ بات معلوم نہ ہوتی تو اور کس کو معلوم ہوتی کہ یہ کمزور اور ناتواں انسان اپنی زبان سے کچھ ہی کہا کرے، لیکن فطرت کے تقاضوں کو ٹھکرا کر وہ ایک کامیاب زندگی ہرگز ہرگز نہیں گزار سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں ہم کو کوئی ایسی چیز نہیں ملتی ہے جو فطرتِ انسانی سے ٹکراتی ہو، مذہب کا یہ غلط تصوّر انسانوں کو کسی زمانے میں بھی مذہب کی مفید تعلیمات سے صحیح طور پر روشناس نہ کرا سکا۔

مذہب کے حامیوں نے اعتدال ملحوظ نہ رکھا، اس لئے رُہبانیت، تعصّب، دنیوی ترقی اور لذّات سے نفرت، غرض اسی قسم کی بہت سی باتوں کو مذہب کا ایک حصّہ بنا دیا، اس کے برخلاف مذہب کو انسانی زندگی کا ضمیمہ کہنے والوں نے روحانیت کو جو کہ مذہب کا خاص جوہر تھی فنا کر دیا، اور مصلحتِ وقت کو دیکھ کر دنیا کے جس کام کو کرنا چاہا مذہبی جامہ پہنا کر کر ڈالا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادّیت غالب آ گئی، ہر قسم کے سیاسی ظلم و ستم ہوتے رہے، اقتصادی اور معاشرتی بے اعتدالیاں دل کھول کر کی گئیں، اور مذہب ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے، اور آج بھی اس متمدّن دنیا میں یہی ہو رہا ہے، اور اس قسم کے لوگوں کو

اسلام کا مذہبی تصور

اسلام سے پہلے اکثر و بیشتر مذاہب میں مذہب کا عام تصور یہ تھا کہ جس طرح
انسان اپنی دنیا کی زندگی کو کامیابی سے گزارنے کے لئے بہت سے کام کرتا ہے،
اسی طرح مذہب بھی انسانی زندگی کا ایک ضمیمہ ہے، اور اس کا تعلق صرف اس رشتے
سے ہے جو انسان اور اس کے معبود کے درمیان ہے، اس رشتے کو باقی رکھنے کے
لئے چند مذہبی رسموں کا ادا کرنا کافی ہے، تاکہ وہ بعد کی زندگی میں ذریعۂ نجات بن
سکیں۔ دنیا کے کاموں میں انسان پورے طور پر آزاد ہے، اس کا تعلق
اپنے نفس، دوسرے انسانوں اور دنیوی کاموں سے ایک الگ چیز
ہے، اور اس کا تعلق اپنے معبود سے ایک دوسری چیز، ان دونوں
میں کوئی ربط و علاقہ نہیں ہے۔ مذہب کے اس عام تصور کے علاوہ
عیسائیوں اور یہودیوں کے ایک خاص طبقے میں مذہب کا تصور یہ

اسلام میں عبادت کا مفہوم

اسلام کا مذہبی تصوّر یہ ہے کہ ایک انسان صبح سے شام تک جتنے کام کرتا ہے مثلاً کھانا پینا، رہنا سہنا، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، حکومت و سیاست، تعلیم و تعلّم، گھریلو زندگی میں عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک، اور گھر سے باہر کی زندگی میں دوسرے انسانوں کے ساتھ برتاؤ، غرض یہ کہ اپنے تمام کاموں کو انجام دیتے وقت وہ اگر یہ نیّت کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل اور اس کی رضا جوئی کے لئے ہیں تو ان سب کا شمار عبادت میں ہوگا۔ عبادت کے اس وسیع مفہوم سے ناواقف ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ عبادت چند مخصوص اعمال کی ادائگی کا نام ہے، جن کے ادا کرنے کے بعد انسان عبادت کے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے، اور پھر اُس کو اختیار ہے کہ دنیا کے دوسرے تمام کاموں میں وہ جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔ پیغمبر اسلام نے جاہل عربوں کی بہت سی فضول رسموں کو چھڑا کر مذہب کا ایک ایسا فطری و عقلی تصوّر پیش کیا جس کا نام قرآن کریم میں اسلام بتایا گیا ہے۔

لغوی اعتبار سے اسلام نام ہے اُس مذہب کا کہ جس میں اللہ کی مرضی اور اُس کے حکم کو ہر چیز پر مقدّم رکھ کر اس کی اطاعت کی جائے۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل (علیہما السلام) ایک بڑی آزمائش میں پورے اترنے اور سرِ تسلیم خم کر دینے کے بعد ہی مسلم کہلائے۔[1]

---

[1] دی عربس صفحہ ۳۶ The Arabs By Philip K. Hitti P. 36

کا مطلب اس طرح واضح کیا ہے۔

" تمدّنِ اسلام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کسی ملک یا زمانے کی مسلمان آبادی نے اکٹھے ہو کر جغرافی، تاریخی، نسلی حالات کے ماتحت اپنے لئے کچھ دستور وضع کر لئے اور اُن کا نام تمدّنِ اسلام رکھ لیا، تمدّنِ اسلام نام ہے اسلام کے تمدّن کا، مسلمانوں کے تمدن کا نہیں[1]"

اسی مقالے میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

" تمدّنِ اسلام صرف وہ تمدن و طرزِ زندگی ہے جو ثابت ہے قرآن پاک سے، اور سنّتِ رسولِ انام سے۔ اور یا پھر مستنبط ہوتا ہے انھیں دونوں سے، ائمّہ مجتہدین واکابر فقہا کے قواعد واصول سے[2]"

اسلام کی غلط نمایندگی کا خراب اثر

اسلام کی صحیح تعلیمات سے اکثر مسلمان واقف نہیں، غیر مسلموں کا تو ذکر ہی کیا ہے، وہ تو اسلام ان باتوں کو سمجھتے ہیں جن کو مسلمان کرتے ہیں، اور مسلمانوں کے کردار وگفتار سے ہی اسلامی تعلیمات کے اچھے یا بُرے، مفید یا غیر مفید ہونے کا اندازہ و فیصلہ کرتے ہیں، اور چاہیئے بھی یہی تھا کہ مسلمان اسلام کی صحیح طور پر نمایندگی کرتے، اس کی تعلیمات سے صحیح واقفیت کے بعد اُن پر عمل پیرا ہو کر بلا امتیاز مذہب وملّت تمام انسانوں بلکہ نسلِ انسانی کے لئے اپنے آپ کو مفید بناتے، اور اسلام کی قدر و منزلت لوگوں کی نگاہ میں بڑھاتے، مگر ہوا یہ کہ بہت سے غیر مسلموں کو یہ کہنا پڑا کہ

---

[1] تمدّنِ اسلام کا پیام بیسویں صدی کی دنیا کے نام [2] ایضاً (مولانا عبدالماجد دریابادی کا ایک مقالہ)

پیغمبرِ اسلام نے اپنے قول اور عمل سے ثابت کر دیا کہ مذہب انسانی زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتا ہے، اور انسانی دل و دماغ کو ایک ایسا نور بخشتا ہے جس کی مدد سے مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے والا شخص "الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ" (سیدھے راستے) پر چلنے لگتا ہے، اور حق و باطل میں آسانی سے فرق محسوس کرنے لگتا ہے۔ جب اسلام پوری زندگی کا لائحہ عمل اور پروگرام ہے تو یہ ضروری ہے کہ جس طرح وہ انسان کو ایک خالق کے احکام کی تعمیل کی طرف بلاتا ہے، اسی طرح یہ بھی بتائیے کہ اس خالق کی تمام مخلوقات کے ساتھ انسان کا کیا برتاؤ ہونا چاہیئے، تاکہ مخلوق کا رشتہ مخلوق سے بھی درست ہو کر ایک خالق سے بندھ جائے۔ اسلامی تعلیمات کا ذرا غور سے مطالعہ کرنے والا بڑی آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک پورے طور پر مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق مخلوق سے برتاؤ نہ کرے، اور زیادہ کھلے ہوئے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی نظریئے کے مطابق انسان کا تعلق خدا سے اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان کا تعلق انسان اور دوسری تمام مخلوقات سے درست نہ ہو جائے۔ لکھنے میں تو صرف یہ ایک ہی سطر معلوم ہوتی ہے، لیکن درحقیقت اس میں انسان کی پوری اجتماعی زندگی آجاتی ہے جس کی تفصیل کے لئے غالباً سینکڑوں صفحات بھی ناکافی ہوں گے۔ اسلام ایک خاص طریقۂ فکر اور ایک خاص طریقۂ عمل کا نام ہے، اور ان دونوں سے مل کر اسلامی تہذیب و تمدّن بنتا ہے، یہاں تمدّن اور مذہب دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں، جو لوگ تمدّنِ اسلام کا مطلب مسلمانوں کا تمدّن سمجھتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، کیونکہ اس طرح سے اسلام کے صحیح خط و خال کبھی ان کے سامنے نہیں آسکتے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے ایک مقالے میں تمدّنِ اسلام

کی روشنی میں ایجادات کرے، تاکہ خالقِ کائنات کا حکیم و بصیر، علیم و خبیر ہونا اس پر پوری طرح منکشف ہو جائے۔ یہ ہے اسلام کا مذہبی تصوّر، جو انسان کی پوری زندگی کو خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، سیاسی ہو یا معاشی، گھیرے ہوئے ہے، اور کسی قدم پر انسانی ترقی میں روڑے نہیں اٹکاتا۔ کون نہیں جانتا کہ چھٹی صدی عیسوی یعنی زمانۂ جاہلیت کے مقابلے میں دنیا آج زندگی کے مختلف شعبوں میں کس قدر حیرت انگیز ترقی کر چکی ہے، اور کر رہی ہے۔ لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ مذہب کا تصوّر ترقی یافتہ ممالک میں آج بھی وہی ہے جو صدیوں پیشتر تھا، اسی غلط تصوّر نے لوگوں کو روحانیت سے دور کر کے مادّیت کا پجاری بنا دیا ہے، جس کے نتائج ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

مذہبِ اسلام دینی ترقی کے ساتھ ساتھ کس طرح دنیوی ترقی کی ضمانت کرتا ہے؟ اس کے جواب میں علّامہ سیّد علی بلگرامی کی مشہور کتاب "تمدّنِ عرب" کی چند سطریں کافی ہوں گی، جن کے پڑھنے سے صحیح اندازہ ہو جائے گا کہ مشہور فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر لیبون کے اسلام کے بارے میں کیا تاثرات ہیں۔

"اسلام کا مکمّل اور تمدّنی اثر فی الواقع بے حد و بے پایاں ہے، زمانۂ جاہلیت میں عربستان کا ملک چھوٹے چھوٹے خود مختار صوبوں اور قبیلوں میں منقسم تھا، جو ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑا کرتے تھے، ظہورِ پیغمبرِ اسلام سے ایک صدی کے اندر عربوں کا ملک دریائے سندھ سے اندلس تک پہنچ گیا، اور ان تمام شہروں میں جہاں اسلامی پرچم جلوہ فگن تھا ایک حیرت انگیز ترقی نظر آتی تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے جس کے اعتقادات کو مسائلِ علومِ طبیعی کے ساتھ پورا توافق ہے، اور ان اعتقادات کا خاصہ یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کو نرم کریں، اور ہم میں نیکی اور انصاف اور دوسرے

جو اسلام مسلمانوں کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے وہ تو ضرور قابلِ قدر ہے، لیکن جو اسلام مسلمانوں کا ہے اُس کو ہماری عقلیں قبول نہیں کرتیں۔

جب اسلام ایک ایسے طریقۂ فکر و عمل کا نام ہے کہ جس میں انسان کو اپنے ہر کام میں خدا اور اُس کے رسول کی مرضی کو مقدّم رکھنا ضروری ہے تو اس کو سب سے پہلے یہ سمجھنا اور جاننا چاہیئے کہ اس پر خالق کی طرف سے کیا کیا ذمّہ داریاں اور کیا کیا حقوق ہیں؟ اس کے بعد وہ اُن لوگوں کے حقوق پہچانے جن سے کہ اس کا واسطہ پڑتا رہتا ہے، وہ اس کے والدین اور بھائی بہن ہوں یا بیوی بچّے، یا دُور اور نزدیک کے رشتے دار، پڑوسی ہوں یا معاملہ دار، ہم مذہب ہوں یا غیر مذہب والے، دوست ہوں یا دشمن، غرض ہر شخص کے ساتھ مناسب طور پر برتاؤ کرنا سیکھے، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انسانوں کے علاوہ حیوانوں اور کائنات کی ہر چیز سے استفادہ کرتے وقت اسلامی طریقۂ فکر و عمل کو پیشِ نظر رکھے، کیونکہ اس کے دائرے میں فرد کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر جماعت کی زندگی کے بڑے سے بڑے معاملات آجاتے ہیں، وہ یہی بتاتا ہے کہ ایک شخص کو کھانے پینے، وضع قطع، پاکی و ناپاکی، دوسرے انسانوں سے تعلّقات اور لین دین، غرض زندگی کے مختلف معاملات میں کن باتوں کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، تاکہ صراطِ مستقیم سے اُس کا قدم نہ بھٹکنے پائے، اس کا فیصلہ بھی کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں کن کن باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے، اور لوگوں سے تعلّقات کن اصول کو سامنے رکھ کر پیدا کئے جائیں جن سے معیشت، معاشرت، سیاست اور زندگی کے تمام شعبوں کو ترقی ہوتی ہے، اور یہی اسلامی طریقِ فکر اس کا فیصلہ بھی کرتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کو انسان عقل کی مدد سے اپنے اور دوسرے انسانوں کے لئے مفید اور کارآمد بنائے، علم و تجربات

ماحول کو بڑا دخل ہوتا ہے جو اس کو دوام اور ہمیشگی بخشنے نہیں دیتا۔ وہ خاص خاص حالات میں بڑھتی اور پلتی ہے۔ اور قوم کے زوال کے ساتھ اس پر بھی زوال آجاتا ہے۔ تعمیر کے لئے تو صرف مذہب کی صحیح تعلیمات بنیاد بن سکتی ہیں۔ صحیح مذہب کی صحیح تعلیمات زندگی کے حدود کو متعین کرکے ان حدود کے اندر انسانی زندگی کو پھلنے پھولنے کا پورا پورا موقع دیتی ہیں۔ یونانیوں اور مصریوں کی وہ قدیم تہذیب کہ جس نے اُن کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا، یہ ضروری نہیں ہے کہ آج بھی یونانی اور مصری لوگ اُس کو زندہ کرکے مہذب قوموں کے امام بن جائیں۔

ہر آسمانی مذہب زندگی کے کچھ ہمہ گیر اصول رکھتا ہے، جو ہر ملک و قوم اور زمانے کے لئے عام ہوتے ہیں، وہ باپ دادا کی اندھی تقلید کا کبھی قائل نہیں ہوتا، اس کی تعلیمات عام انسانوں کی بھلائی چاہنے والی رُوح اپنے اندر رکھتی ہیں، صحیح اور سچّے مذہب کی ایک بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی تعلیمات پر عمل کرنے سے انسانوں کی سماجی زندگی کا معیار ہر اعتبار سے بلند ہو جاتا ہے، اخلاق درست ہونے لگتے ہیں، اور انسانی برادری کا رشتہ وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے، جس مذہب کی تعلیمات سے انسانوں میں باہم نفرت پھیلنے لگے اور تعلیمات پر عمل کے باوجود سماجی زندگی کا سدھار نہ ہو سکے اس کا شمار سچّے مذاہب کی فہرست میں صحیح نہیں ہو سکتا۔ انسان خالقِ کائنات کا شاہکار ہے، اور اس شاہکار کی فلاح اور ترقی کے لئے جو جو طریقے مفید ہو سکتے تھے وہ سب اس کو بتا دیئے گئے، اور کہہ دیا گیا کہ اگر وہ ان بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرے گا تو اس کی انفرادی و اجتماعی زندگی سکھ اور چین سے گزر جائے گی، خالقِ کائنات کو یہ بات پسند ہے کہ یہ دنیا اچھائی اور اچھے لوگوں سے آباد رہے، پھر یہ

مذاہب کی رواداری پیدا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفیانہ خیال سے مذہب بدھ کو تمام سمیا طیقی مذاہب کے اعتقادات پر ترجیح ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جب مذہب بدھ کو عوام النّاس کی سمجھ کے مطابق بنانے کی ضرورت پڑی تو اس میں ایک انقلاب کلّی کرنا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ترمیم شدہ مذہب اسلام سے بہت گھٹ گیا۔[1]"

اسلام اور اس کی تعلیمات کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے علمِ تاریخ کے مبصّر پروفیسر محمد مجیب لکھتے ہیں۔

"اسلام نے آدمی کو دنیا کی تمام نعمتوں کا حقدار مانا ہے، مگر اعتدال پر بھی زور دیا ہے، کہ یہ نعمتیں آدمی کو اپنا غلام نہ بنا لیں، علم حاصل کرنا، دنیا کی قدرتی دولت سے فائدہ اٹھانا، اور زندگی کو ہر ممکن طریقے سے بہتر بنانا، یہ بھی ایسے کام ہیں جنھیں اسلام نے آدمیت کے ساتھ وابستہ کیا ہے، اور یہ سب ہے اس لئے کہ اسلام نے سمجھئے ایک ہی سانس میں انسان کو خدا کا بندہ بھی کہا ہے اور اُسے دنیا کا بادشاہ بھی بنایا ہے، ایک ایسا بادشاہ جس کی شان فقیری میں ہے، اور جس کی حکومت خدمت اور ایثار سے مستحکم اور مضبوط ہوتی ہے۔[2]"

تہذیب تہذیب پکارنے والے شاید نہیں جانتے، یا اگر جانتے ہیں تو قصداً نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ تہذیب کا لفظ انسانوں میں نفرت اور قومی عصبیت پیدا کرتا ہے، ان کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی بجائے اور دور کر دیتا ہے کسی قدیم تہذیب کے مٹے ہوئے نشانات سے کسی ملک کی تعمیر نہیں ہو سکتی، کیونکہ تہذیب میں

---

[1] تمدنِ عرب صفحہ ۱۲۱ - ۱۲۲ (علامہ سید علی بلگرامی) مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن [2] دنیا کی کہانی صفحہ ۱۱۸ - ۱۱۹۔

بھی اعتدال ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے، سب جانتے ہیں کہ کھانا پینا انسانی زندگی کے لئے کس قدر ضروری ہے، لیکن اگر اس میں بھی اعتدال سے کام نہ لیا جائے تو انسانی تباہی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ اسلام نے کھانے پینے کا ایک مختصر اور جامع قانون بتا دیا، وہ یہ ہے۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ۝ (الاعراف)	خوب کھاؤ پیو اور حد سے مت نکلو، بیشک اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے حد سے نکل جانے والوں کو (بیان القرآن)

اسراف نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مقرر کی ہوئی حد سے آگے نہ بڑھو، جس کھانے یا پینے کی چیز سے کسی فرد یا سماج کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اس کا شمار اسراف میں ہوگا، مذہبِ اسلام نے جن چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے ان کو نہ کھانا اور جن کے نہ کھانے کا حکم دیا ہے اُن کو کھانا، یہ بھی اسراف ہے یعنی حلال کو حرام کر دینا اور حرام کو حلال کر دینا، خدائی قانون کی حد سے آگے بڑھ جانا ہے۔ کوئی شخص جائز و ناجائز کی تمیز کئے بغیر دوسروں کا مال کھانے لگے، اس کو بھی اسراف کہا جائے گا، کوئی شخص خوب کھاؤ پیو کا غلط مطلب سمجھ کر اتنا کھا پی جائے کہ بیمار ہو جائے، یا مر جائے تو اسراف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ انسان اتنا کھائے کہ مر جائے، یا بیمار ہو جائے، اور سماج اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اپنی ہی دولت کوئی شخص کھانے پینے یا دوسروں کو کھلانے میں اتنی بے دردی سے صرف کرے کہ چند دنوں کے بعد فاقے کی نوبت آ جائے، اس کا شمار بھی اسراف میں ہوگا، کفایت شعاری کے خیال سے اتنا کم خرچ کیا جائے کہ اہل وعیال کا پیٹ نہ بھرے، اور وہ بھوکے رہ جاتے ہوں۔ ایسا کرنا یقیناً خدائی قانون کی حد سے بڑھ جانا ہے۔ قرآن کریم میں اس قسم کے بہت سے

کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی آسمانی مذہب اس قسم کی باتیں بتائے کہ جن سے انس و محبّت کی بجائے نفرت و عداوت کی بُو آتی ہو۔

اسلام کو انسانی جماعت کا مذہب قرار دیتے ہوئے بڑے دلکش انداز میں پروفیسر محمد مجیب لکھتے ہیں۔

" اسلام ایک لمبے سلسلے کی آخری کڑی ہے ، وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پُرانا بتاتا ہے جتنا کہ آدمی اور اس کی انسانیت ، اور اتنا ہی تازہ جتنی کہ آج کی اُمنگیں ، وہ اپنا رشتہ ہر قوم سے اور ہر قوم کے دینی رہنماؤں سے جوڑتا ہے ، انسان کی فطرت اور اس کی عقل اسلام کی زمین ہے ، انسان کا دل اور اس کے حوصلے اسلام کا آسمان، اس کی نظر کسی ایک زمانے، کسی ایک حالت پر نہیں ہے، بلکہ پیچھے اور آگے کے ہر زمانے اور ہر حالت پر، وہ الگ الگ آدمیوں ہی کا نہیں ، قوموں اور سماجوں کا مذہب ہے، اور الگ الگ سماجوں ہی کا نہیں ، پوری انسانی جماعت کا مذہب ہے ۔ اسلام نے تاریخ سے قوّت بھی حاصل کی اور سبق بھی لیا ، اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس میں نہ وہ انتہا پسندی دیکھتے ہیں جو انسانی زندگی کو کاٹ کر دین اور دنیا کے نام سے دو ٹکڑے کر دیتی ہے ، اور جذبۂ دینی کو شخصی مذاق اور رجحان کی سُوکھی روٹی پر پالتی ہے ، نہ روحانیت سے وہ بدگمانی پاتے ہیں جو عقل اور تجربے کے سوا ہدایت کے اور تمام ذریعوں کو چھوڑنے سے ترقی کے ہر رستے کو ایک بند گلی بنا لیتی ہے [1] "

قرآن کریم نے اپنی تعلیمات کے بڑے مقصد یعنی انسانوں کی سماجی زندگی کے سدھار کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہت جگہ عام انسانوں کو خطاب کیا ہے ، اور معمولی باتوں میں

---

[1] دنیا کی کہانی صفحہ ۱۱۱ - ۱۱۲

کی طرح بیک وقت صلابت اور لچک دونوں موجود ہیں، یہ وہ زندگی اور معاشرہ ہے جس پر کسی قوم و نسل کی چھاپ اور کسی قومیت اور وطنیت کا ٹھپّہ نہیں، یہ انسانیت کی دولت مشترکہ ہے، جس میں کسی قوم اور ملک کی اجارہ داری نہیں، اس سے نہ چین کو انکار ہو سکتا ہے نہ ہندوستان کو عار، نہ ایران کے لئے وحشت کی کوئی وجہ ہے، نہ یورپ کے لئے گریز کی کوئی راہ، پر امن اور کامل زندگی کے لئے اس کے سوا کوئی نمونہ ہی نہیں۔

آپ کا جی چاہے تو آپ اس زندگی کو بھی تہذیب کہہ سکتے ہیں جو ان عقائد واحکام سے وجود میں آئی ہے، لیکن آپ اس کو عربی تہذیب یا ایرانی تمدّن نہیں کہہ سکتے، اس کو کسی ملک اور قوم اور اس کے طرز تعمیر اور فنون لطیفہ سے دلچسپی نہیں، اور وہ کسی قومی تمدّن یا ملکی تہذیب کی نمائندہ اور وکیل نہیں، ہر ملک میں اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے، اور ہر قوم اس کو اپنا سکتی ہے، مٹ جانے والے تمدّنوں پر اس کی بنیاد نہیں، ایمانیات وعقائد اور غیر متبدّل حقائق پر اس کی بنیاد ہے جو نبی دنیا میں لے کر آئے، اس لئے اس کے مٹنے اور دوبارہ زندہ کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے، نہیں ہے طلسمِ افلاطوں

اس کے لئے علیحدہ دعوت واحیاء کی ضرورت نہیں، اسلام کی دعوت اس کی دعوت ہے، اور یہ دعوت ہر وقت زندہ وتابندہ ہے[1]"

---

[1] ماہنامہ الفرقان نومبر ۱۹۶۱ء (لکھنؤ)

کلّی اصول بتائے گئے ہیں، اور عمل کرنے والوں کو میانہ روی اور حدود و اعتدال سے آگے نہ بڑھنے کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ وہ اُن پر عمل کرکے سماج کے بہتر افراد بن سکیں۔ نیز اسلام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس کی آسمانی کتاب کا ایک بڑا حصّہ ان فضائل و آداب پر مشتمل ہے کہ جن پر عمل کرکے ایک انسان صحیح معنی میں انسان بن سکتا ہے۔

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے ایک مضمون "مذہب یا تہذیب کس کی دعوت صحیح؟" کا کچھ اقتباس پیش کیا جاتا ہے، جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ مذہب کو چھوڑ کر محض تہذیب کے سہارے انسان ایک کامیاب زندگی نہیں گزار سکتا، اور اسلامی نقطۂ نظر سے مذہب اور تہذیب دو چیزیں الگ الگ نہیں ہیں۔

"دعوت اور جدوجہد کی چیز دراصل صحیح اور غیر فانی مذہب ہے جس کو اللہ کے پیغمبر ہر ملک اور ہر دور میں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری اور دائمی طور پر لے کر آئے، انھوں نے اس کے ذریعے سے انسانوں کو دنیا اور آخرت کی فلاح کا پیغام دیا، خالق سے ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑا، توحید خالص کا سبق پڑھایا، حساب کتاب کی اُخروی زندگی کا منتظر بنایا، نیکی اور بدی کے معیّن حدود بتائے اور اخلاق و معاشرت و حقوقِ باہمی کے وہ بے خطا اصول و ضوابط عطا کیے جن پر ہر دور میں حیاتِ انسانی کی تنظیم ہو سکتی ہے، اور مدنیّت صالحہ وجود میں آتی ہے، اُن کے احکام پر عمل کرنے سے خود بخود ایک زندگی پیدا ہوتی ہے جو افراط و تفریط اور ہر طرح کی بے اعتدالیوں سے پاک ہوتی ہے، ایک معاشرہ قائم ہوتا ہے جو امن و سکون، اطمینانِ قلب، اشتراک و تعاون اور اعتدال و توازن کا بہترین نمونہ ہوتا ہے، اس کی بنیادیں ٹھوس لیکن اس کی فضا وسیع ہے، اس میں فولاد

اس پر جمے رہیں اور اپنے اعتقاد کو پختہ کرنے میں لگے رہیں، کیوں کہ اللہ، اُس کے فرشتوں، اُس کے رسولوں اور روزِ قیامت سے انکار کا نتیجہ بڑی گمراہی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، اور انسان راہِ ہدایت سے دور جا پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا موجود ہونا اس قدر واضح اور روشن ہے کہ کسی آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے پر منطقی دلائل پیش نہیں کئے گئے، اور نہ اس کے اس طریقے سے ثابت کرنے کی ضرورت تھی۔ تجربہ شاہد ہے کہ منطقی دلائل زبانوں کو تو خاموش کر دیتے ہیں لیکن دلوں کو اطمینان نہیں بخشتے، جو شخص منطقی اصطلاحات اور طرزِ استدلال سے واقفیت نہیں رکھتا وہ الفاظ کا اُلٹ پھیر دیکھ کر بغیر مطمئن ہوئے خاموش ہو جاتا ہے، اور جو شخص کچھ واقفیت رکھتا ہے وہ اُس وقت تک کے لئے خاموش ہو جاتا ہے جب تک کہ ان دلائل کی تردید نہ کر سکے، لیکن جو شخص اُسی فن کے مسلمات سے ان دلیلوں کو توڑ دیتا ہے وہ کیسے مطمئن ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے دلائل کے متعلق ہکسلے نے لکھا ہے۔

"جتنی لایعنی ہرزہ سرائیوں کے پڑھنے کا مجھے موقع ملا ہے اُن میں سب سے بدتر ان لوگوں کے دلائل ہیں جو خدا کے متعلق موشگافیاں کرتے ہیں[1]"

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق (اقبال)

یہاں متکلمین پر تنقید مقصود نہیں ہے، ان لوگوں نے اپنے زمانے کے رجحانات کا اندازہ کرنے کے بعد وہ طریقہ اختیار کیا جس کو انھوں نے مفید سمجھا، اور انھیں

---

[1] الدین القیم صفحہ ۸۰

وجودِ باری تعالیٰ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ (۱۳۶)

اے ایمان والو تم اعتقاد رکھو اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس کتاب کے ساتھ جو اس نے اپنے رسول پر نازل فرمائی اور ان کتابوں کے ساتھ جو کہ پہلے نازل ہو چکی ہیں، اور جو شخص اللہ کا انکار کرے اور اس کے فرشتوں کا اور اس کی کتابوں کا اور اس کے رسولوں کا اور روزِ قیامت کا، تو وہ شخص گمراہی میں بڑی دور جا پڑا۔ (بیان القرآن)

اس آیت میں ان مسلمانوں کو جو کہ پکے مسلمان اور مومن بننے کا ارادہ رکھتے ہوں حکم دیا گیا ہے کہ اللہ پر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر، قرآن کریم پر، اور قرآن کریم سے پہلے جو کتابیں نازل کی گئیں ان پر پکا ایمان رکھیں،

ترجیح دے گی، اب اگر وہ علت بھی ممکن ہے تو پھر سوال پیدا ہو گا کہ یہ ممکن کیسے موجود ہوا، یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ علت اور معلول کا ایک لمبا اور کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ چلتا رہے، کیونکہ اس صورت میں یہ لازم آئے گا کہ ممکنات پائے ہی نہ جائیں، حالانکہ ممکنات موجود ہیں، اور اُن کے پائے جانے کا سبب کوئی ممکن تو ہو نہیں سکتا، اس لئے کوئی واجب ہی ان کے پائے جانے کا سبب ہو گا، کیونکہ موجود کی دو ہی قسمیں ہیں واجب اور ممکن۔ جب ممکن سبب اور علت نہیں ہو سکتا تو واجب ہی سبب ہو گا۔ اس کو واجب الوجود کہہ دیا جائے یا خدا ایک ہی بات ہے۔

علم الکلام کی کتابوں میں اللہ تعالیٰ کے وجود پر جہاں بہت سی دلیلیں بیان کی گئی ہیں اوپر لکھی ہوئی دلیل بھی بیان کی گئی ہے، لیکن یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ یا اسی قسم کی اور دلیلیں انسانی دماغ کے ان تمام سوالات کا صحیح جواب ہو سکتی ہیں کہ جو اس میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور اگر اس قسم کی دلیلیں مفید اور کارگر ثابت ہوتیں تو یہ قطعاً ناممکن تھا کہ انسان کا بنانے والا خود انسان کے دماغ کی ساخت اور اس کی نفسیات سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ طریقہ اختیار نہ کرتا جس سے انسان کا دماغ مطمئن ہو جاتا، خالقِ انسان کا یہ طریقہ اختیار نہ کرنا ہی اس بات کی دلیل اور کھلی ہوئی دلیل ہے کہ انسان اپنی بنائی ہوئی اصطلاحات سے وجودِ صانع کی گتھی کو نہیں سلجھا سکتا، ممکن ہے کہ اور اُلجھ جائے۔ قرآن کریم میں ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (الانعام)	اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے اور وہی بڑا باریک بین باخبر ہے۔ (بیان القرآن)

بات تو تاریخ کی کتابوں سے اب بھی معلوم ہوتی ہے کہ یونانی فلسفے سے متاثر ہو کر جب اسلام کے بنیادی عقائد پر حملے کئے گئے تو مسلمان علماء کی ایک جماعت نے اُسی قسم کے ہتھیاروں سے ان حملوں کا مقابلہ کیا جن کو مخالفین استعمال کرتے تھے۔ ہکسلے کا اشارہ جس قسم کے دلائل کی طرف ہے، ان میں سے نمونۃً صرف ایک دلیل ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

متکلّمین کی ایک عام دلیل

قانون سببیّت کو پیش نظر رکھ کر اللہ تعالیٰ کا وجود ثابت کرنے کے لئے عام طور پر جس دلیل کو پیش کیا جاتا ہے وہ دلیل امکان ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم بہت سی ایسی چیزیں دیکھتے ہیں جو موجود ہونے کے بعد فنا ہو جاتی ہیں، اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جو پہلے موجود نہ تھیں لیکن بعد میں موجود ہو گئیں، چیزوں کے موجود ہونے کے بعد فنا ہو جانے، اور موجود نہ ہونے کے بعد موجود ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا نہ تو پایا جانا اور موجود ہونا ضروری ہے، کیونکہ اگر ان کا پایا جانا اور موجود ہونا ضروری ہوتا تو وہ فنا نہ ہوتیں، اور نہ اُن کا فنا ہو جانا ضروری ہے ورنہ موجود ہی نہ ہوتیں۔ اس قسم کی چیزوں کو کہ جن کا نہ تو پایا جانا ضروری ہے اور نہ پایا جانا ضروری ہے، منطق کی اصطلاح میں ممکنات کہا جاتا ہے، ممکنات جمع ہے ممکن کی، ممکن اُس کو کہا جائے گا کہ جو ہو بھی سکے اور نہ بھی ہو سکے، پایا بھی جا سکے اور نہ بھی پایا جا سکے، لیکن جب پایا جائے اور موجود ہو تو اس کے لئے کوئی نہ کوئی سبب اور علت ہونا چاہئے، اور وہی علت اس کے ہونے کو نہ ہونے پر

جہاں تک ممکن ہو سکے کسی آیت میں تاویل نہ کرے، بجز اس صورت کے کہ تاویل خود نص سے مفہوم ہوتی ہو، کیونکہ قرآن مجید میں تین ایسی خاصیتیں پائی جاتی ہیں جو اور کسی کلام میں نہیں ہیں۔ اوّل یہ کہ اس کے دلائل سے جس طرح کہ عام لوگوں کو تسلّی ہو جاتی ہے اسی طرح وہ منطق کے معیار پر بھی پورے اُتر سکتے ہیں، اور اُن سے وہ لوگ بھی مطمئن ہو جاتے ہیں جو بغیر کسی منطقی دلیل کے کسی بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، دوسرے یہ کہ وہ اس قدر صاف ہیں کہ ان میں عموماً تاویل کی ضرورت نہیں پڑتی، تیسرے یہ کہ اگر تاویل و تفسیر کی ضرورت ہوتی بھی ہے تو خود قرآن مجید کی دوسری آیتوں سے مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور ہمیں کسی آیت کو اُس کے ظاہری معنی سے پھیرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

ممکن اور واجب کے الفاظ کا استعمال، اور ممکنات کے کبھی ختم نہ ہونے والے سلسلے کا تصوّر کئے بغیر بھی تو انسان کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسی ہستی ضرور ہوگی جو سب سے پہلے موجود ہوگی، یعنی اُس سے پہلے کوئی اور چیز نہ ہوگی، اور اسی سے کائنات کی ابتداء ہوئی، یہ اور بات ہے کہ کائنات کی ابتداء کی کیفیت تک عقلِ انسانی کی رسائی نہ ہو سکے، جس طرح اس ہستی کی حقیقت کہ جو سب سے پہلے موجود تھی، کوئی نہیں بتا سکتا، لیکن اس بات کے ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں کہ کوئی ہستی سب سے پہلے تھی ضرور۔ اگر نظامِ ہستی میں خدا کا انکار اس لئے کیا جائے کہ کوئی چیز خود بخود ہو کیسے سکتی ہے، اور کسی ایسی ہستی کا تصوّر ہی ممکن نہیں ہے تو اس کا انکار کرنے والا یہی بات تو کہے گا کہ نظامِ ہستی کی بنیاد خدا پر نہیں ہے۔[1]

---

[1] ملخص از "ابن رشد" صفحہ ۱۴۸ - ۱۴۹ (تالیف مولانا محمد یونس فرنگی محلی)

متکلمین نے وجودِ باری پر جو دلیلیں قائم کی ہیں وہ عام فہم انسانی سے بالاتر ہیں، ان کو کفر و اسلام کی کسوٹی قرار دینا سخت غلطی ہے، ان دلائل سے صرف ایک علت العلل یا کسی مرجح کے خیالی وجود کا ثبوت ہوتا ہے، جو فلاسفہ کے خیالی واجب الوجود سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، برخلاف اس کے قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے پر جو دلائل بیان کئے ہیں وہ آسان مقدمات پر مبنی ہیں، جن سے ایک معمولی عقل کا انسان بھی اسی طرح مطمئن ہو جاتا ہے جس طرح کہ ایک فلسفی۔ ان میں اصطلاحی الفاظ کی بھرمار نہیں ہے، اور تمام مقدمات یقینی ہیں جن کو سمجھنے یا سمجھانے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کے علاوہ بڑی بات یہ ہے، کہ قرآن کریم کی دلیلوں سے ایک ایسے خدا کا ثبوت ہوتا ہے جو قادر، دانا، رحیم، سمیع، بصیر اور یکتا ہے عقلی دلیلوں سے محض ایک خیالی خدا کا ثبوت ہوتا ہے، اور اوصاف کا وہاں ذکر ہی نہیں۔

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی (اقبال)

اندلس کے مشہور فلسفی علامہ ابنِ رشد نے نہ صرف عقیدۂ وجودِ باری بلکہ تمام اسلامی عقائد کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل نیچے لکھا جاتا ہے۔

"جو شخص شریعت کو بدعتوں سے پاک کرنا چاہتا ہے اُس کو چاہیئے کہ قرآن مجید کو اپنے سامنے رکھے، اور ایک ایک عقیدے کے دلائل کو الگ الگ جمع کرتا جائے، اور جس حد تک قرآن مجید نے کوئی تعلیم دی ہے اُس کو اسی حد تک رکھے، اور

اس کے لئے کسی بڑی مدّت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، جس زمانے میں انسان غار میں رہتا، سردی گرمی سے بچنے کے لئے جانوروں کی کھالیں استعمال کرتا، تن ڈھانکنے کے لئے درختوں کے پتّے جسم پر لپیٹتا، گھاس پھوس وغیرہ کھاتا، پتھر کی بنی ہوئی بہت سی چیزیں کام میں لاتا، اور مادّی زندگی میں ترقی کا خیال اس کو زیادہ نہ ستاتا تھا، اس زمانے میں بھی تو اس کو مظاہر فطرت اور کائنات پر غور کرنے کا بہت موقع ملتا ہوگا، اور اس کا دینی احساس زیادہ بیدار ہوگا، جیسے کہ موجودہ زمانے کا انسان تہذیب و تمدّن اور مادّیات کے جال میں اُلجھ جانے کی وجہ سے خالق کائنات کو بھولتا جا رہا ہے۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ انسان کے توحید تک پہنچنے میں تدریجی ترقی کے لوگ قائل ضرور ہیں، لیکن مذہب پر اظہار خیال کرنے والوں کی ایک بڑی جماعت جس میں کہ ماہر انسانیات اور نفسیات بھی شامل ہیں، کا خیال یہ ہے کہ انسان فطرتاً موحد یعنی ایک خدا کا ماننے والا ہے، لینگ (Lang) نے کہا ہے کہ "ایک معبود کے موجود ہونے کا عقیدہ آسٹریلیا، افریقہ اور امریکہ کے وحشیوں میں بھی موجود تھا"[1]۔ اشمٹ (Schmidt.) نے بڑی تحقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ "ایک بڑے معبود" کا تصور قدیم ترین زمانے کے انسانوں میں موجود تھا"[2]۔

اسلامی نقطۂ نظر بیان کرتے ہوئے علّامہ سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

" وحی محمدی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدّن

---

[1] الدّین صفحہ ۱۰۲ [2] الدّین صفحہ ۱۰۳

بلکہ کسی اور ہستی پر ہے کہ جو خود بخود ہے، اس انکار میں خدا کے اقرار کا پہلو موجود ہے،
خدا پرست اس کو خدا کہہ دیتا ہے، اور مادّہ پرست خدا کا انکار کرکے اس خود بخود
ہونے والی ہستی کا اقرار کرنے کے بعد اس کو مادّہ کہہ دیتا ہے، یا کسی اور طرح سے
اس کی تعبیر کرتا ہے۔

اسلام اور عقیدۂ وجود باری تعالیٰ

مذہب اسلام کائنات کی بنیاد ایک ایسی ہستی پر قائم کرتا ہے جو خود بخود ہے،
اور مذہبی زبان میں اس کو خدا کہا جاتا ہے، اُس نے خدا کو سمجھانے کے لئے منطقی
دلائل اس لیے پیش نہیں کئے کہ انسانی عقل میں اُس کے وجود کا تقاضہ موجود
تھا، اور یہ بات کچھ خوش عقیدگی کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے، بلکہ یہ ایک ایسی
حقیقت ہے کہ جس سے انکار کرنا مشکل ہے، جن لوگوں نے ادیان اور مذاہب
کی ابتدا کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے، ان میں سے کچھ لوگ تو ضرور یہ کہتے
ہیں کہ دین کی ابتدا بے بنیاد باتوں اور بت پرستی سے ہوئی، اور جس طرح کہ
انسان نے صنعت وحرفت اور مختلف علوم میں رفتہ رفتہ ترقی کی اور درجۂ کمال
تک پہنچ گیا اسی طرح ایک بڑی مدت میں دین میں ترقی کرنے کے بعد وہ توحید
کے مرحلے پر پہنچا، یورپ میں انیسویں صدی میں اس نظریئے کے ماننے والے لوگ
کافی تعداد میں موجود تھے۔ اسپنسر (Spencer) کا بھی یہی خیال
تھا، حالانکہ رفتہ رفتہ ترقی مختلف علوم وفنون میں تو ہو سکتی ہے، اور سمجھ میں آتی
ہے، لیکن کائنات کو دیکھ کر انسانی ذہن کا اس کے بنانے والے کی طرف جانا،

کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کی دعوت دی گئی ہے اور خدا کے سمجھانے کا یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں ہے۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ۝ أَمْ خَلَقُوا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بَل لَّا يُوقِنُونَ ۝ (الطور)	ہاں کیا یہ لوگ بدون کسی خالق کے خود بخود پیدا ہو گئے ہیں، یا یہ خود اپنے خالق ہیں، یا انھوں نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے بلکہ یہ لوگ یقین نہیں لاتے۔ (بیان القرآن)

مطلب یہ ہے کہ کوئی مخلوق چیز کسی کی خالق نہیں ہو سکتی، بلکہ خالق کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ غیر مخلوق ہو، یہ ساری کائنات جس میں کہ یہ عقلمند انسان بھی شامل ہے، اور جو اسی عقل کی وجہ سے تمام مخلوقات پر حکومت کر رہا ہے، بہر حال موجود ہے، اور اس کے موجود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، اب سوال یہ ہے کہ یہ کائنات کسی کے بن بنائے آپ سے آپ بن گئی ہے یا خود اس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے، بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی نہیں ہو سکتی۔ جب یہ دونوں باتیں ممکن نہیں تو یہ ضروری ہے کہ اس کائنات اور کائنات کی تمام مخلوقات کا کوئی ایسا خالق ہو کہ جو خود مخلوق نہ ہو، کیونکہ اگر وہ بھی مخلوق ہو گا تو خالق نہیں ہو سکتا۔ اگر ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے انسان اپنے آپ کو مخلوق ماننے کے لئے تیار نہیں ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے کہ میں خالق ہوں تو ذرا ایمانداری سے بتا دے کہ یہ آسمان اور زمین کیا انسان کے بنائے ہوئے ہیں؟ اور یہ بات اس کا دل بخوبی جانتا ہے کہ زمین و آسمان اس نے نہیں بنائے ہیں، اور نہ وہ بنا سکتا ہے۔ جب وہ آسمان اور

سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا، جس میں سامانِ تمدن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو، مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی، ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے، آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں، غرض جماعتِ انسانی کا کوئی حصہ، زمین کا کوئی گوشہ، زمانے کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے، اس لئے فطرت سے تعبیر کیا ہے[1]"

خالقِ انسان کے علم میں یہ بات نہ ہوگی تو اور کس کے علم میں جس وقت اپنی زبان سے یہ کہے گا کہ "خدا کوئی چیز نہیں ہے" تو دل میرے موجود ہونے کا اقرار کر رہا ہوگا، یعنی میرے وجود کے اس کے دل و دماغ میں موجود اور مرتسم ہیں کہ جس وقت وہ اپنی زبان سے میرے موجود ہونے کا انکار کرے گا، اُس کا دل اس کی زبان کو جھٹلائے گا، جب حقیقت یہ ہے تو پھر خالقِ انسان کا انسان کے سامنے اپنے موجود ہونے پر دلیلیں پیش کرنا ضروری نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار مظاہرِ فطرت پر غور کر کے

---

[1] سیرت النبی جلد ۴ صفحہ ۴۶۲ (علامہ سید سلیمان ندوی)

شیخ محی الدین ابن عربی ارشاد فرماتے ہیں۔

"تکوینِ عالم سے خداوند ذوالجلال کو حاشا اپنا کوئی ذاتی نفع اور نقصان مدنظر نہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی صفات کمال کے مظاہر پیدا کرے، تاکہ مخلوق اپنے خالق کو ان مظاہر کے واسطے سے سمجھ سکے"[1]

جب انسان کوئی بہت اچھی بنی ہوئی چیز دیکھتا ہے تو فوراً اس کا ذہن اس کے بنانے والے کی طرف جاتا ہے، اور بنانے والے کی تعریف و توصیف میں اس کے منہ سے الفاظ نکلنے لگتے ہیں، اگر اس کو بنانے والے کا حال معلوم نہیں ہوتا تو وہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ لوگوں سے معلومات حاصل کرے، بالکل یہی حالت زمین و آسمان اور تمام مظاہر قطرت کی ہے کہ ان کو دیکھنے کے بعد انسان بیساختہ ان کے بنانے والے کی تعریف کرنے لگتا ہے، یہ مدح و ثنا بھی عبادت ہے، اور تعریف کرتے وقت تعریف کرنے والے کے دل و دماغ میں دو باتیں ضرور آئیں گی، اوّل یہ کہ وہ جس ذات کی تعریف کر رہا ہے، وہ اس حمد و ثنا کو مستحق ہے، دوسرے یہ کہ وہ ذات انسان کے مقابلے میں اعلیٰ اور برتر ہے، کیونکہ اس کی طاقت و قدرت میں وہ باتیں ہیں جن کو انسان نہیں کر سکتا، یہ ناممکن ہے کہ انسان کے دل و زبان پر یہ تمام باتیں آئیں اور وہ یہ سمجھتا رہے کہ اس کا مخاطب ایک اندھا، گونگا اور بہرہ مادّہ ہے، جو نہ تو کسی کو دیکھ سکتا ہے اور نہ کسی کی بات سن سکتا ہے، ورنہ یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ معبود تو بے حس و شعور اور عقل و حکمت سے خالی ہو، اور اس کی پرستش کرنے والے میں یہ تمام صفات موجود ہوں، حالانکہ عقل کا تقاضہ

---

[1] علم الکلام صفحہ ۱۲۸ (تالیف مولانا محمد ادریس کاندھلوی)

زمین جیسی دو موٹی چیزیں بھی نہیں بنا سکتا تو وہ خالق کیسے ہوسکتا ہے؟ اس لئے بہتر یہی ہے کہ وہ کسی خالق کو مان لے۔

وحی الٰہی نے ایک خالق کی طرف عقلمند انسانوں کو ذیل کی آیت میں متوجہ کیا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۝ (آل عمران)	آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کے بدلنے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (بیان القرآن)

صرف آسمان و زمین نہیں، بلکہ جتنی چیزیں آسمان و زمین کے درمیان میں ہیں سب ہی ایک صانع اور خالق کا پتہ دیتی ہیں، ان غافلوں کا ذکر نہیں کہ جو غور ہی کرنا نہ چاہتے ہوں، لیکن عقل والے تو ان کو دیکھ کر ایک خالق کا پتہ پا جاتے ہیں، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ چاند اور ستارے، ان سب کا مقرّرہ وقت پر چھپنا اور نکلنا بتاتا ہے کہ یہ کسی کے حکم کے پابند ہیں، کائنات کا یہ نظم اور اس کی ہر چیز کا قاعدہ و قانون میں جکڑا ہوا ہونا، حیوانوں اور انسانوں کے جسموں کی بناوٹ، اُن کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، رات کی تاریکی اور دن کا نُور، چاند سُورج اور ان کی مقررّہ رفتار، دن اور رات کا باقاعدہ اُلٹ پھیر، موسموں کا باضابطہ تغیّر، درختوں کی پیداوار، پھلوں کی نمود، یہ تمام باتیں ایک زبردست ہمہ گیر، ہمہ داں اور ہمہ بیں خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں، عالم کی اس کارفرما طاقت کو ہم اللہ کہتے ہیں، اور اسی کے دستِ قدرت میں اس عالم کا نظام ہے۔

اُن کو تکلیفیں نہ پہنچاؤ، ہم تمہارے پروردگار کی طرف سے نشان لے کر آئے ہیں، سیدھے راستے پر چلنے والے کے لئے سلامتی ہے، ہم کو اطلاع ملی ہے کہ جھٹلانے، اور روگردانی کرنے والے پر عذاب ہوگا۔ یہ باتیں سن کر فرعون نے پوچھا، اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يَا مُوسَىٰ (طٰہٰ)	وہ کہنے لگا کہ پھر تم دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ (بیان القرآن)

فرعون چونکہ اپنے آپ کو معبود کہتا تھا، اس نے خالق اور صانع کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ تم جس رب کا ذکر کر رہے ہو وہ ہے کون؟ میں تو اُس کو جانتا بھی نہیں۔

یہاں یہ بات غور کرنے کی ہے کہ فرعون کے سوال کے جواب میں بجائے اس کے کہ موسیٰ علیہ السلام ذاتِ باری تعالیٰ کے موجود ہونے پر خاموش کر دینے والے دلائل پیش کرتے، انھوں نے اللہ تعالیٰ کا خالقِ کائنات ہونا بتلایا، اور اس جواب کو فرعون کے سوال کا صحیح جواب خیال کیا۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيٓ أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُۥ ثُمَّ هَدَىٰ۔ (طٰہٰ)	موسیٰ علیہ السلام نے کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب بناوٹ عطا فرمائی پھر رہنمائی فرمائی (بیان القرآن)

حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے فرعون سے یہ کہا کہ جس پروردگار کا میں بھیجا ہوا ہوں وہی اس کائنات کی ہر چیز کا خالق اور رہنما ہے، یہ بات سن کر فرعون نے کہا کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ جن پہلے لوگوں نے تمہارے رب کی پرستش نہیں کی بلکہ اور معبودوں کو پوجا اُن کا کیا حشر ہوگا، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ پروردگار ان تمام لوگوں کے

یہ ہے کہ معبود عابد سے اشرف و افضل ہو۔

فلسفۂ ادیان کے ماہر مشہور جرمن فلاسفر ماکس میولر (Max Muller) کا نظریہ یہ ہے کہ مشاہدِ طبیعت اور مظاہرِ فطرت نے انسان کی عقل کو اس قدر مسحور کر دیا کہ ایک غالب و قادر ہستی کہ جس کے مقرر کردہ نظام کو کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، کے ماننے بغیر اس کو کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا۔ مختصر الفاظ میں ماکس میولر کا مطلب یہ ہے کہ جب سے مظاہرِ فطرت اور انسان موجود ہیں اُسی وقت سے وجود خالق اور صانع کا عقیدہ موجود ہے۔[1]

جرمن فلسفی کانٹ (Kant) نے کہا ہے کہ میرا دل دو چیزوں پر غور کرکے حیرت و عظمت سے بھر جاتا ہے، اور جتنا زیادہ ان پر غور کرتا ہوں میری حیرت میں اضافہ ہوتا ہے، ان میں سے ایک تو یہ تاروں بھرا آسمان، جو میرے اوپر ہے اور دوسرا اخلاقی قانون کہ جس سے میرا ضمیر متاثر ہے۔

مظاہرِ فطرت کے متعلق یہ تو ان لوگوں کے خیالات اور احساسات ہیں جو مادّی علوم و فنون سے بہرہ ور ہیں، اب ذرا ان بزرگ ہستیوں کے احساسات کا بھی جائزہ لیجئے جن کے سینے نورِ ربّانی سے معمور تھے۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاکر اپنی نبوّت کا دعویٰ پیش کرو، یہ دونوں ارشادِ خداوندی کی تعمیل میں فرعون کے دربار میں گئے اور کہا کہ ہم دونوں تمھارے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دو، اور

---

[1] ملخص از الدّین صفحہ ۱۰۹

شہد کی مکھیوں کی طرح جماعت کی خدمت میں لگ کر اپنے آرام و راحت کو بھلا دینا پسند نہیں کرتا۔ لیکن سماجی زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنے ہی نفع کو نہ دیکھے، بلکہ دوسرے لوگوں کے نفع اور فائدے کا بھی اُس کو خیال رکھنا چاہیئے، یہ بات بہت ہی مشکل ہے کہ وہ لوگوں سے بالکل علیحدہ رہ کر اپنی تمام ضروریات پوری کر سکے، اس مشکل کا پورا پورا اندازہ کرتے ہوئے انسان نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ کبھی کبھی ایسا بھی کرنا چاہیئے کہ دوسروں کے فائدے کو اپنے فائدے پر مقدم رکھا جائے، اور اپنے مصالح کو دوسروں کی خاطر قربان کر دیا جائے، تاکہ اجتماعی زندگی میں خرابیاں پیدا نہ ہوں، اور اس نے ایک بالاتر ایسی وہمی ہستی کو مان لیا کہ جو اس کے تمام کاموں کی نگرانی کرتی ہے، اجتماعی زندگی کو کامیاب بنانے کی خاطر انسان نے جزا و سزا کے نظریئے کو بھی مان لیا۔ برگسوں کا خیال ہے کہ اس طرح سے انسان نے انفرادی اور اجتماعی مصالح میں ایک صحیح توازن پیدا کر دیا۔

عجیب بات ہے کہ اجتماعی زندگی کی کامیابی کو انسان نے اس قدر ضروری سمجھا کہ اس کے نظام کو باقی اور قائم رکھنے کے لئے اس نے ایک وہمی خدا مان لیا۔ اگر فطری طور پر انسان میں خدا کے وجود کا تقاضا موجود نہ تھا تو اس کا خیال کسی وہمی ہستی کی طرف گیا کیسے؟ پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اجتماعی زندگی اور اس کو کامیاب بنانے کا خیال تو بیشک ضروری تھا، اور ہر معقول انسان اس کا ضروری ہونا تسلیم کر لے گا۔ کیا اس سے زیادہ ضروری خیال یہ نہ تھا کہ جن مظاہر فطرت سے وہ فائدہ اُٹھا رہا ہے، اُن پر غور کرتا اور سوچتا کہ اجتماعی نظام کو بہتر بنانے اور اس کو باقی رکھنے کے لئے تو اس نے ایک وہمی

اعمال سے باخبر ہے اور وہ انسانوں کی طرح غلطی نہیں کرتا اور نہ بھولتا ہے، یہاں بھی موسیٰ علیہ السلام اس کی بات کا بہت مختصر جواب دینے کے بعد مظاہر فطرت بیان کرنے لگتے ہیں، جیسا کہ ذیل کی آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ فِیْ كِتٰبٍ لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَلَا یَنْسَى ۝ اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى (طٰہٰ)

فرعون نے کہا اچھا تو پہلے لوگوں کا کیا حال ہوا، موسیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں کا علم میرے پروردگار کے پاس دفتر میں ہے، میرا رب نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے، وہ ایسا ہے جس نے تم لوگوں کے لئے زمین کو فرش بنایا اور اس میں تمھارے واسطے راستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس کے ذریعے سے مختلف اقسام کے نباتات پیدا کئے، خود کھاؤ اور اپنے مواشی کو چراؤ، ان سب چیزوں میں عقل مند لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ (بیان القرآن)

بیرگسون (Bergson) اور وجود باری تعالیٰ

فرانسیسی فلاسفر بیرگسون (Bergson) کا خیال ہے کہ عام انسانوں میں کسی خالق کے موجود ہونے کا عقیدہ اجتماعی زندگی کے تقاضے کی بنا پر پیدا ہوا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے اعتبار سے خودغرض ہے، اور ہر موقعے پر اپنے نفع اور فائدے کو مقدّم رکھنا چاہتا ہے، چیونٹیوں اور

کہ عقیدۂ وجودِ باری کی جڑیں انسان کے دل کی گہرائیوں میں جگہ پکڑے ہوئے ہیں، اور نفسِ انسانی کے مختلف تجربے اللہ کے وجود پر گواہی دیتے ہیں، کوئی انسان اگر اپنی آنکھ و کان بند کرے اور کائنات کی ہر چیز سے بالکل علیحدہ ہو کر سوچے اور غور کرے تو اس کا دل پکار اُٹھے گا کہ کوئی ہستی موجود ہے، اپنے اندر کمال کی کمی کسی کامل ذات کے موجود ہونے پر اُس کے یقین کو پختہ کرتی رہتی ہے، اور اپنے اندر کمال کی کمی کا احساس اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ کسی کامل ترین ہستی کا تصوّر اس سے پہلے ہو، ڈے کارٹ کہتے ہیں کہ اللہ یا ہستیٔ کامل کا تصوّر ایک مثبت (Positive) تصوّر ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝ (الذّاریات)	اور یقین لانے والوں کے لئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری ذات میں بھی تو کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا (بیان القرآن)

زمین میں کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں؟ اس پر علومِ جدیدہ کے ماہرین غور کر رہے ہیں اور بیشمار فوائد حاصل کر رہے ہیں، لیکن خود انسان کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا اور کیا خزانہ پوشیدہ ہے، اس پر غور کرنے والے بہت کم ہیں، اور نہ ہونے کے برابر ہیں، انسان کی زندگی، اس کے اندرونی جذبات و احساسات، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات ان میں سے ہر چیز ایک اعجوبہ ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، زمین میں جو چیزیں پوشیدہ ہیں ان کا پتہ انسان چلا رہا ہے، جس سے قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت کے پہلے حصّے کی تصدیق ہو رہی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہے گی، اب رہا آیت کا دوسرا حصّہ وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ اس کے

ہستی کو مان لیا ہے، لیکن اس کائنات اور مظاہرِ فطرت کو قوانین میں جکڑنے والی بھی تو کوئی نہ کوئی ہستی ضرور ہوگی اور وہ وہمی نہ ہوگی، کیونکہ کائنات اور اس کے قوانین وہمی نہیں ہیں، اجتماعی زندگی کا نگراں اور اس کا محاسب بھی اسی ہستی کو کیوں نہ مان لیا جائے۔

بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ یہی برگسوں (Bergson) اس بات کا قائل ہے کہ انسانوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو صاحبِ کشف و الہام ہوتے ہیں، غیر معمولی عقل اور روحانی قوت رکھتے ہیں، ان کا الہام ایک رشتہ ہوتا ہے جو اُن کو اُس ایک قوت یا ہستی سے ملا دیتا ہے جس کی تجلّی کا مظہر یہ لوگ ہوتے ہیں: وہ دوسری چیزوں کو بدل سکتی ہے، مگر خود اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔[1] یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب ایک ایسی قوت موجود ہے کہ جس کی تجلّی کا مظہر خاص خاص لوگ ہوتے ہیں، جو دوسری چیزوں کو بدل سکتی ہے اور خود نہیں بدلتی تو پھر عام انسانوں کی اجتماعی زندگی کے نظام کو درست رکھنے اور اس کی نگرانی کے لیے ایک وہمی اور خیالی ہستی کو کیوں مانا گیا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جس ہستی کی طرف عام انسانوں کا ذہن گیا ہے وہ حقیقتاً موجود ہو۔ یہ فرق ضرور ممکن ہے کہ عام انسانوں کو اس کے موجود ہونے کا اتنا پکّا یقین نہیں ہوتا جتنا کہ ان خواص کو ہوتا ہے جن کا ذکر برگسوں نے کیا ہے، اور یقین کے مراتب میں فرق سے کوئی چیز وہمی اور خیالی نہیں بن جاتی۔

انتہائی غور و تامّل کے بعد ڈےکارٹ (Descartes) نے کہا ہے

---

[1] اللہ صفحہ ۱۶ (تالیف عبّاس محمود عقاد مصری۔ مطبوعہ دار الہلال۔ القاہرہ)

تو پھر تم ایسے خالق کے سامنے اپنی جبینِ نیاز کو کیوں نہیں جھکاتے ؟ اور کیوں اس کا اقرار نہیں کرتے ؟ اسی طرح اگر دن اتنا لمبا ہو جائے کہ ختم ہی ہونے میں نہ آئے، تو یہ ممکن نہیں ہے کہ لوگ دن ہونے کی وجہ سے مسلسل کام کرتے رہیں گے، اور ان کا دل سونے اور آرام کرنے کو نہ چاہے گا۔ یقیناً وہ گھبرا جائیں گے، اور بے اختیار ان کا دل چاہے گا کہ اب رات ہو جائے۔ دن کو رات میں کوئی انسان یا ان کے خود ساختہ معبود نہیں تبدیل کر نہیں سکتے، اللہ تعالیٰ ہی میں قدرت ہے کہ وہ دن کو رات بنادے۔ جس خدا نے انسان کی اس عارضی اور چند روزہ زندگی کے لئے ایسا مناسب و معقول انتظام کیا ہے، کیا وہ انسان کی ابدی زندگی کی آرزو کو نظر انداز کر دے گا، اور اس کو پورا کرنے کا سامان نہ کرے گا ؟

اوپر لکھی ہوئی آیات میں پہلے کہا گیا ہے اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ (کیا تم سنتے نہیں ہو) اور اس کے بعد آگے چل کر کہا گیا ہے اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (کیا تم دیکھتے نہیں ہو) اس طرز تعبیر میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی دلیلوں کے ہوتے ہوئے بھی خدا کا انکار کرتے ہیں عموماً وہ دو قسم کے لوگ ہیں، ایک وہ جو خدا سے متعلق کسی بات کا سننا تک پسند نہیں کرتے، یا سنتے تو ہیں لیکن اس طریقے سے نہیں سنتے کہ جو کسی بات کے سننے کا صحیح طریقہ ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کسی دلیل سے کیا اثر قبول کر سکتے ہیں، دوسرے وہ لوگ جو سنتے تو ہیں لیکن سننے کے بعد اس کی تکمیل دیکھنے سے نہیں کرتے، اس لئے وہ بھی کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی تکمیل صرف سننے سے نہیں ہوتی بلکہ سننے کے بعد ان کو دیکھنا اور ان پر غور کرنا بھی ضروری ہوتا ہے،

متعلق علامہ ابن کثیر نے اپنی مشہور تفسیر میں حضرت قتادہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر انسان اپنی خلقت پر غور کرے تو اس کا دل اپنے خالق کی عبادت کے لئے ضرور جھک جائے گا۔

عقلِ انسانی کو کسی خالق کا وجود باور کرانے کے لئے قرآن کریم نے جو دلیلیں بیان کی ہیں، اُن پر کوئی شخص اگر تعصب سے خالی ہو کر غور کرے تو وہ یقیناً کسی صحیح نتیجے پر پہنچ جائے گا۔

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ الَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِضِیَآءٍ ؕ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ۝ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰہُ عَلَیْکُمُ النَّھَارَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِلَیْلٍ تَسْکُنُوْنَ فِیْہِ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۝

(القصص)

آپ کہئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک رات ہی رکھے تو خدا کے سوا وہ کونسا معبود ہے جو تمہارے لئے روشنی کو لے آئے تو کیا تم سنتے نہیں، آپ کہئے کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم پر ہمیشہ کے لئے قیامت تک دن ہی رہنے دے تو خدا کے سوا وہ کون سا معبود ہے جو تمہارے لئے رات کو لے آئے جس میں تم آرام پاؤ کیا تم نہیں دیکھتے۔

(بیان القرآن)

اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے زمانے کو دو حصوں یعنی رات و دن میں جو تقسیم کیا ہے درحقیقت یہ تمہاری سہولت و آرام کے لئے ہے، اگر رات اتنی لمبی ہو جائے کہ کبھی ختم ہونے ہی میں نہ آئے تو تم کس قدر اُکتا جاؤ گے، اور یہ بات تو تم بھی جانتے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی بھی رات کو دن نہیں کر سکتا

ہیں کہ جن کو ہم نہیں دیکھ سکتے، کیا ایسی صورت میں ہم ان کے موجود ہونے سے انکار کردیں گے؟ نہیں، کیونکہ کسی چیز کے تسلیم کرنے کا صرف مشاہدہ ہی ایک ذریعہ نہیں ہے۔ جواہر (Atoms) دکھائی نہیں دیتے، لیکن ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ہم اپنے جسم میں درد کی تکلیف محسوس کرتے ہیں، خود درد کو کبھی نہیں دیکھا، لیکن اس کے باوجود کہتے ہیں کہ درد موجود ہے۔ برق (Electricity) یہ مادہ نہیں بلکہ توانائی (Energy) ہے، اس میں نہ تو جسمیت ہے، نہ اپنی ذات سے پہچانی جاتی ہے اور نہ صفات سے بلکہ آثار سے پہچانی جاتی ہے، چیزوں پر جو اس کے اثرات ہوتے ہیں اُن سے صفات کا علم ہوتا ہے اور صفات سے ذات کا علم ہوتا ہے، برق برقیوں سے زیادہ لطیف ہے، خواہ وہ مثبت برقیے (Protons) ہوں یا منفی برقیے (Electrons) ہوں، مگر اس کے باوجود برقی توانائی کے پائے جانے سے کوئی انکار نہیں کرسکتا، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی توانائی برق سے زیادہ لطیف ہو، وہ جسم نہ رکھتی ہو، نہ دکھائی دیتی ہو، لیکن اس کے آثار کی وجہ سے اس کو موجود ماننا عقل انسانی کے لیئے ناگزیر ہو۔

قرآن کریم میں بہت صاف الفاظ میں کہہ دیا گیا۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (الانعام)	اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہوسکتی اور وہ سب نگاہوں کو محیط ہو جاتا ہے اور وہی بڑا باریک بین باخبر ہے۔ (بیان القرآن)

قرآن کریم میں دوسری جگہ کہا گیا ہے اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

یہی وجہ ہے کہ خالقِ فطرت نے مظاہرِ فطرت پر غور کرنے کا بار بار حکم دیا ہے۔

زندگی کے اندھیرے میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے بغیر روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آسکتی، اور نہ اس کائنات کی الجھی ہوئی ڈور کا سرا ہی ہاتھ آسکتا ہے۔ جب یہ مشاہدہ ہے کہ کوئی چیز بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتی تو پھر زمین، آسمان، چاند سورج اور ستارے وغیرہ یہ عظیم الشان چیزیں آپ ہی آپ کیسے بن گئیں؟ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کی بناوٹ میں بڑی حکمت پائی جاتی ہے اور حیرت انگیز طریقے سے تیار کی گئی ہیں، اور یہ بھی صاف نظر آرہا ہے کہ یہ تمام کائنات مکمل نظم و ضبط کے ساتھ چل رہی ہے، اس مشاہدے سے صرف اسی بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اس عالم کا کوئی خالق اور پیدا کرنے والا ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی حکمت و تدبیر والا ہے، اس کی بصیرت و دانائی کی کوئی حد نہیں، اس پر ایک لمحے کے لئے بھی غفلت طاری نہیں ہوتی، اور ہر چیز اس کی نظر کے سامنے ہے، اور جس طرح یہ کائنات کسی بنانے والے کے بغیر بن نہیں سکتی اسی طرح کسی چلانے والے کے بغیر چل بھی نہیں سکتی، جب ایک موٹر، ریل اور جہاز کسی چلانے والے کے بغیر نہیں چل سکتا، اور چلانے والے کی ذرا سی غفلت سے یہ چیزیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں اور بیٹھنے والوں کو بھی تباہ کر دیتی ہیں، تو کسی بیدار اور واقف کار ہستی کے بغیر یہ کارخانۂ عالم کیسے صحیح اور سلامت رہ سکتا ہے۔

مادّیت کے پجاری یہ کہتے ہیں کہ دیکھے بغیر ہم خدا کو کیسے تسلیم کرلیں؟ نہیں معلوم کہ خدا کے معاملے میں اس قدر زیادہ احتیاط سے کہ جو انسان کو اس کے تسلیم کئے ہوئے اصول سے شہادت کیوں کام لیا گیا؟ دنیا میں بہت سی ایسی چیز

۱۱۹

کیا پیغمبروں کی اتنی بڑی تعداد خلاف واقعہ بات کہہ سکتی ہے؟ جب یہ ممکن نہیں تو پھر ایسی متواتر اور اتنی بڑی تعداد کی شہادت کے ہوتے ہوئے وجود باری تعالیٰ پر شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے) ظاہر ہے کہ اس عالم آب وگل میں رہتے ہوئے
ایسے نورِ ربّانی کا احاطہ کوئی نگاہ نہیں کرسکتی کہ جو اپنی وسعت میں آسمانوں اور
زمینوں کو لیئے ہوئے ہے، اور یہی اُس کی لطافت ہے، اور خبیر ہونے کا مطلب
یہ ہے کہ رائی کے ایک دانے کو اگر کسی پتھر کا جگر چیر کر اُس میں رکھ دیا جائے، یا اس
ایک دانے کو پوری دنیا میں کسی ایک جگہ چھپا کر رکھ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کو اس کا
علم ہو جائے، اور یہ ممکن ہے کہ اس دانے کو اگر تمام دنیا کے انسان ڈھونڈھنے
کے لیئے نکلیں تو اُن کو نہ ملے، اور سب کی نگاہوں سے اوجھل رہے، جب انسان
کی نگاہ ایک موجود چیز کے ڈھونڈھنے سے قاصر و عاجز رہ سکتی ہے، اور وہ رائی کا
دانہ اگر اس کو نہ ملے تو محض اس وجہ سے کہ وہ انسانی نگاہ سے اوجھل ہے عقلِ سلیم
اُس کے موجود ہونے سے انکار نہیں کرسکتی، تو جس ہستی کے موجود ہونے پر کائنات
کا ذرّہ ذرّہ گواہی دے رہا ہے، اگر انسان کی محدود نگاہ اس کو نہ دیکھ سکے، اور
اس کا ادراک نہ کرسکے تو اس کے پائے جانے سے انکار کہاں تک معقول اور درست ہوگا۔

مذکورہ بالا دلائل کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے پر سب سے زیادہ
زبردست دلیل وہ شہادت ہے جو ابتدائے آفرینش سے ہر زمانہ اور ہر ملک میں
تمام انبیاء علیہم السلام دیتے آئے ہیں، ہر آسمانی مذہب نے کسی نہ کسی نوعیت سے
خالقِ کائنات کے وجود پر دل سے اعتقاد رکھنے کی تاکید کی ہے۔ یہ وہ بنیادی
عقیدہ ہے کہ اس کے بغیر مذہب کی عمارت کا قائم رہنا ممکن نہیں، تمام انبیاء
علیہم السّلام جن کی سچائی میں کوئی شک نہیں کرسکتا اور جن کی فہم و فراست اور
صداقت و دیانت پر کبھی شبہ نہیں ہوسکتا ایک خدا کے ماننے پر زور دیتے رہے،

والا ہے، وہ لوگ بہت زیادہ پریشانی اور خطرے کے وقت میں اللہ کو یاد کرتے اور اس سے مدد کے طالب ہوتے تھے۔"

مختلف زبانوں میں اللہ تعالیٰ کے مختلف ناموں پر بحث کرتے ہوئے ماکس میلر نے لکھا ہے۔

"اِلاہ" کے شروع میں اگر الف لام نہ لگایا جائے تو عربی زبان میں اس کے معنی عام اور غیر معین دیوتا یا خدا کے ہوں گے، لیکن اگر اَلاِلٰہ یا اَللّٰہ کہا جائے تو یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خدا کا نام ہو جائے گا، جیسا کہ یہ ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے خدا کا نام تھا۔"

عرب کے مشرکین بھی ابراہیم علیہ السّلام سے عقیدت رکھنے کی وجہ سے کائنات کے خالق کو اللہ ہی کہا کرتے تھے۔ پھر قرآن شریف میں اُن کو مشرک کیوں کہا گیا؟ اس کا جو جواب حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "الفوز الکبیر" میں دیا ہے وہ درج کیا جاتا ہے" ان کا شرک یہ تھا کہ وہ بعض بندوں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے، ان کا اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح دنیا میں بادشاہ اور شہنشاہ اپنے مقربین میں سے کچھ لوگوں کو اطرافِ ممالک میں اپنا قائم مقام بنا کر بھیج دیتے ہیں اور تا وقتیکہ بادشا

ے دی عربس (فلپ کے، ہتّی) دوسرا ایڈیشن مطبوعہ لندن صفحہ ۲۲

The Arabs: A Short History By Philip K. Hitti,

ے انٹروڈکشن ٹو دی سائنس آف ریلیجن صفحہ ۱۱۲

Introduction to the Science of Religion By F. Max Muller

توحید و معاد

توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ذات اور صفات دونوں اعتبار سے یکتا مانا جائے، عبادت و بندگی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی نہ کی جائے۔ جو شخص ذات کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کو واحد و یکتا سمجھتا ہو مگر اس کی کسی صفت میں کسی دوسرے کو اسی جیسا سمجھتا ہو وہ صحیح معنی میں موحد کہلانے کا مستحق نہیں۔

عرب کے مشرکین کہا کرتے تھے کہ رب العالمین ایک ہی ہے اور اللہ کی ذات میں کوئی اس کا شریک و مقابل نہیں ہے، یعنی ایک ہی ہستی ہے جس کو رب العالمین کہا جا سکتا ہے۔

مشہور مورخ فلپ ہٹی نے لکھا ہے۔

" اللہ کا نام عربوں میں قدیم زمانے سے چلا آتا تھا، مکہ کے لوگ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ وہ خالق ہے، انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنے

سب سے پہلے ملتی ہے، وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے۔[1]

کلمۂ توحید کی جامعیت

کلمۂ توحید میں اسلام کے تینوں بنیادی اصول آجاتے ہیں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں توحید یعنی ایک خدا کے معبود ہونے کا اقرار ہے اور محمدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق ہے، اس کلمہ کے دونوں حصّوں پر یقین رکھنے والا مسلمان کہلائے گا ضمنی طور پر اس کلمے سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ جب کوئی شخص آپ کی رسالت کا یقین کرے تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان تمام باتوں کو سچ سمجھے جن کو آپ نے خدا کی طرف سے بیان کیا ہے، اور اگر کوئی شخص ان میں شک کرتا یا ان باتوں میں سے کسی کا انکار کرتا ہے تو اس کے متعلق یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ آپ کی رسالت پر یقین نہیں رکھتا، اور وہ مسلمان نہیں ہے، ایک مرتبہ سوچ سمجھ کر رسالت کی تصدیق کے بعد کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ پیغمبر کی فلاں بات ہماری عقل قبول نہیں کرتی۔ قبول کرے یا نہ کرے، اس بات سے انکار کرنا رسالت سے انکار کرنا ہے، دوسرے پیغمبروں کی طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ہم کو بتایا کہ ایک ایسا دن آئے گا جبکہ ہر انسان سے اس کے اعمال کے متعلق پرسش ہوگی، اور وہ جزا و سزا کا مستحق ہوگا۔ اسی کو معاد یا عقیدۂ آخرت کہا جاتا ہے۔

جن لوگوں کو اس کلمہ کی حقیقت پر غور کرنے کا موقع نہیں ملا، اگر وہ اعتقادی طور پر نہیں تو عملی طور پر یہ ضرور سمجھتے ہیں کہ خدا کا اقرار بندگی کے ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے،

[1] سیرت النبی جلد ۴ صفحہ ۳۰۴ (مولانا سید سلیمان ندوی)

کا منافی حکم نہ ہو وہ لوگ جزئی امور میں ہر قسم کے تصرّف کا پورا اختیار رکھتے ہیں، بادشاہ خود چھوٹے چھوٹے کاموں کو انجام نہیں دیتا، بلکہ اپنے ماتحت سرداروں اور مقربین کے سپرد کر دیتا ہے، اور مقرّبین کے حاشیہ نشینوں کے بارے میں ان کی سفارش قبول کرتا ہے، اسی طرح اللہ نے اپنے بعض بندوں کو خلعت الوہیّت سے سرفراز فرمایا ہے، اور اُن خاص بندوں کی خوشنودی اور ناراضگی کا اثر سب لوگوں پر پڑتا ہے، اس خیال کی وجہ سے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اُن خاص بندوں کا قرب حاصل کیا جائے تاکہ اس طریقے سے اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے، اور اپنے کاموں میں ان کی سفارش حاصل کی جائے، ان مقاصد کے پیشِ نظر وہ لوگ ان خاص مقرّبین بارگاہ خداوندی کو سجدہ کرنا، ان کے نام پر قربانی کرنا، ان کی قسم کھانا اور ضروری کاموں میں اُن سے یہ سمجھ کر مدد مانگنا کہ وہ جو چاہیں گے فوراً ہو جائے گا، جائز سمجھتے تھے[1]"

سیرت النبی میں ہے۔

"وحی محمدی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ ایک قادرِ مطلق، خالقِ عالم، اور صانعِ کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے، متمدّن سے متمدّن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سُراغ ملتا ہے، آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا جس میں سامانِ تمدّن، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو، مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی، اُن کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز

---

[1] الفوز الکبیر فی اصول التفسیر صفحہ ۷

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ (اقبالؒ)

توحید کی جو صدا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لگائی تھی اس سے دنیا کا کوئی مذہب، کوئی فلسفہ اور کوئی دماغ اثر قبول کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو آدم کے سامنے محض اس لئے جھکایا کہ اس کی اولاد پر سب سجدے حرام ہو جائیں، وہ رب العالمین کے سوا کسی کو سجدہ نہ کرے، اور سمجھ لے کہ جب فرشتوں جیسی معصوم مخلوق اس کے سامنے جھکا دی گئی تو اب اس کو اس دنیا کی کسی چیز کے سامنے جھکنا کب زیب دیتا ہے۔

اسلام کی ابتدائی و بنیادی دعوت اور پہلا مطالبہ ہے کہ ہم ہر چھوٹی بڑی چیز اور اس کے ہر چھوٹے بڑے فعل و اثر کو بلا شرکت غیرے تمام تر خدا ہی کے قبضے و اختیار میں جانیں اور ظاہری اسباب و وسائل کو صرف ظاہری یا انتظامی واسطہ ہی سمجھیں، خدا کے سوا کسی کو مالک و مختار اور متصرف ہرگز نہ سمجھیں، اللہ کے سوا کوئی دوسرا مالکانہ اختیار کے ساتھ کسی مخلوق کو نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان۔
قرآن کریم نے ایک جگہ نہیں بلکہ بہت جگہ اسلام کی اسی بنیادی اور غیر مشکوک حقیقت کو بیان کیا ہے کہ بندگی و عبادت، اور نفع و نقصان کے معاملے میں مدد چاہنے کا تعلق اللہ کے سوا کسی سے نہ رکھو، اگر نفع حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کی کوئی ظاہری تدبیر اختیار کرو بھی تو یہ سمجھ کر کہ یہ صرف ایک ظاہری واسطہ ہے، جو خود کوئی اثر نہیں رکھتا۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ درصل اس حقیقت کا اقرار ہے کہ زمین و آسمان اور یہ تمام انتظامی اسباب انسان کی خدمت اور غلامی کے لئے پیدا

یعنی اُن کے خیال میں یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ بندگی کا رشتہ قائم رکھتے ہوئے بھی مؤمن اور موحد بن سکتے ہیں، حالانکہ یہ کھلا ہوا عقل کا دھوکا ہے اس لئے کہ اس کلمے میں خدا کے وجود کے اقرار سے پہلے تمام معبودوں کے وجود سے انکار کیا گیا ہے، جس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ مؤمن اور موحد بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی الوہیت کے تسلیم کرنے سے پہلے ہر چیز کی الوہیت سے انکار کیا جائے، اس کے بغیر توحید کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح صرف لا الٰہ کہنا اور الا اللہ سے اثبات نہ کرنا انسان کو دہریت اور الحاد کے گڑھے میں پھینک دیتا ہے۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا!
لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مئے لا سے!
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانہ اِلّا! (اقبالؒ)

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبروں پر وحی کی ابتدا توحید سے ہوتی ہے۔ طور کی پہاڑی پر حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے کہا گیا۔

اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ○ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ○ (طٰہٰ)	اے موسیٰ میں تمہارا رب ہوں، پس تم اپنی جوتیاں اتار ڈالو، تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو اور میں نے تم کو منتخب فرما لیا ہے، سو کچھ وحی کی جا رہی ہے اس کو سن لو، میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، تو تم میری ہی عبادت کیا کرو، اور میری ہی یاد کے لئے نماز پڑھا کرو۔ (بیان القرآن)

اور کمال تک پہنچانے والا بیج سے درخت پیدا کرنا اور درخت کو بتدریج اس حالت تک پہنچا دینا کہ اس میں پھل آنے لگے، یہ شانِ ربوبیت ہی کا ظہور ہے۔
قرآن کریم میں ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○ (الفاتحہ)	سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

جب جہان اور اس کی ہر چیز کا رب اللہ ہی ہے تو پھر کسی دوسرے کی کہاں اور کیسے گنجائش نکل سکتی ہے، اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا یا کسی کا کارساز اور حاجت روا سمجھنا خدائی میں کسی دوسرے کو شریک کر دینے کے برابر ہے۔ انسان ہو یا حیوان، نباتات ہوں یا جمادات، جن ہوں یا فرشتے، اولیاءؒ ہوں یا انبیاءؑ، ان میں سے کسی کو اپنا حاجت روا نہ سمجھنا چاہیئے۔ رب صرف ایک ہے، اور وہ اللہ جل شانہ ہے۔ قرآن کریم نے اُن اہلِ کتاب کو جو توحید کے دعویدار تھے، لیکن انھوں نے پیغمبروں اور اولیاء اللہ کے متعلق ان کی مرضی کے خلاف اعتقادات رکھ کر ان کو حاجت روا سمجھنا شروع کر دیا تھا، ایسے ڈھنگ سے دعوت دی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کے موجودہ عقائد سے بیزار ہے۔

قُلْ یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِہٖ شَیْئًا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا	آپ فرما دیجئے کہ اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان برابر ہے، یہ کہ بجز اللہ کے ہم اور کی عبادت نہ کریں، اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں

کیے گئے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ ان کو اپنا آقا و مخدوم معبود اور مقصود بنا کر ان کے سامنے جھک جائے۔

قرآنی توحید کا منشا، یہ ہے کہ وہ انسان کی پوری زندگی پر چھا جائے، وہ اس کے کسی ایک حصّے پر قناعت کے لیے تیار نہیں ہے، اس کی دعوت جس طرح توحید اعتقادی کی طرف ہے، اسی طرح عملی توحید کی طرف بھی، قرآن کا یہ مطالبہ ہے کہ پوری انسانی زندگی توحید کے سانچے میں ڈھل جائے، اعتقادی توحید کا منشا، یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو ذات و صفات کے لحاظ سے یکتا و یگانہ سمجھے۔

قرآن کریم میں ہے۔

فَلَا تَجْعَلُوا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ)	تم کسی کو اللہ کے برابر کا نہ سمجھو، اور یہ بات تو تم بھی جانتے ہو

نِدّ وہ ساتھ کا اٹھنے بیٹھنے والا کہلاتا ہے جو ہم پلّہ ہو، کہا یہ جا رہا ہے کہ تم کسی کو کسی اعتبار سے بھی اللہ کے برابر نہ سمجھو۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے کوہِ طور پر جو بات سب سے پہلے کہی گئی وہ یہ تھی "اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّکَ" "اے موسیٰ میں تمھارا پروردگار ہوں"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر جو سب سے پہلے وحی غارِ حرا میں نازل ہوئی وہ "اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ" تھی، "اُس پروردگار کا نام لے کر پڑھیے جس نے آپ کو پیدا کیا ہے"۔

کوئی انسان اگر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے محروم ہو جائے تو وہ چند منٹ بھی عافیت کی زندگی نہیں گزار سکتا، "رَبّ" کے معنی ہیں حاجتیں پوری کرنے والا

نقصان ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی چیز کو وہ اپنے لئے نقصان دہ اور ضرر رساں سمجھتا ہے، لیکن تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نقصان دہ نہ تھی۔ اس حقیقت کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ)	اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمھارے حق میں خیر ہو، اور یہ ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمھارے حق میں خرابی ہو، اور اللہ جانتے ہیں اور تم نہیں جانتے (بیان القرآن)

ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا (اقبالؒ)

قرآن کریم میں ہے۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ (یونس)	اور اگر تم کو اللہ تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائے تو بجز اُس کے اور کوئی اُس کا دور کرنے والا نہیں ہے، اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہے تو اُس کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں، وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت بڑی رحمت والے ہیں۔ (بیان القرآن)

بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ (آلِ عمران)	اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے خدا کو چھوڑ کر، پھر اگر وہ لوگ اعراض کریں تو تم لوگ کہدو کہ تم اس کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں۔ (بیان القرآن)

آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں، حالانکہ خود ان بزرگوں کی یہ تعلیم تھی کہ جو کچھ مانگو اللہ سے مانگو، ہمارا اور تمھارا حاجت روا اور مشکل کشا وہی ہے، اس قسم کا کمزور عقیدہ رکھنے والے لوگ کیسے کسی مصیبت کے وقت ثابت قدم رہ سکتے، اور کسی آزمائش میں پورے اتر سکتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ حاجت روا وہی ہو سکتا ہے جو نفع اور نقصان کا مالک ہو، قرآن کریم نے کئی جگہ کھلے ہوئے الفاظ میں کہہ دیا کہ ایسی ہستی اللہ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے چہیتے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (یونس)	آپ فرما دیجئے کہ میں اپنی ذاتِ خاص کے لئے تو کسی نفع کا اور کسی ضرر کا اختیار رکھتا ہی نہیں، مگر جتنا خدا کو منظور ہو۔ (بیان القرآن)

اپنے نفع ونقصان کے بارے میں جو اتنا بے بس ہو، کیا وہ دوسروں کے نفع ونقصان کے بارے میں بے بس نہ ہو گا، بلکہ اگر یہ کہہ دیا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ یہ بیچارہ انسان ابھی تک اپنی عقل کے ذریعے نفع وضرر کے مفہوم ہی کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا ہے، کسی کام یا تدبیر کو اپنے لئے مفید سمجھ کر کرتا ہے، لیکن خلافِ امید

اس کا احساس تم کو ہر وقت رہنا چاہیئے، ورنہ تمہاری غلط تدبیریں تم کو ساری عمر الجھنوں اور پریشانیوں میں مبتلا رکھیں گی۔

عملی توحید کا منشا یہ ہے کہ انسان جو طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ اختیار کرتا ہے، وہ کسی دوسرے کے ساتھ اختیار نہ کرے، یہ فطری امر ہے کہ انسان کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ یکساں نہیں ہوتا، برتاؤ کا مدار تعلقات کی نوعیت پر ہے، قرب و بعد کے لحاظ سے تعلقات میں فرق ہوتا چلا جائے گا، والدین کے ساتھ جیسا برتاؤ ہوگا، بڑے بھائی اور بہنوں کے ساتھ ویسا برتاؤ نہ ہوگا، عزیزوں اور غیروں کے ساتھ برتاؤ میں نمایاں فرق ہوگا، چھوٹوں اور بڑوں کے ساتھ سلوک میں یقیناً فرق ہوگا، کیونکہ اس قسم کا فرق انسانیت کے لوازم میں سے ہے۔ اسی فطری اصول کی بنا پر مخلوق اور خالق کے ساتھ برتاؤ میں بھی فرق ہونا ضروری ہے، کسی مخلوق کو خالق کا مرتبہ دیدینا خلافِ فطرت اور حدودِ انسانیت سے تجاوز ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل اس قسم کا ہونا چاہیئے کہ ویسا طرزِ عمل کسی دوسرے کے ساتھ ہرگز اختیار نہ کیا جائے، ورنہ شرک کہلائے گا۔

"امام فخرالدین رازیؒ نے "تفسیر کبیر" میں مشرکینِ عرب کے شرک کی نوعیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے، مشرکینِ عرب کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے وجود کے قائل ہیں، ان بتوں کو ہم اللہ کے برابر نہیں جانتے، بلکہ ان کو اپنا شفیع (سفارشی) سمجھتے ہیں، اور ان کو اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت اور مرتبے کی وجہ سے اللہ سے ہماری سفارش ضرورت کے وقت کرسکتے ہیں، امام رازی کی تحقیق کے مطابق بت پرستوں کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں، کیونکہ انبیاء میں سے سب سے پہلے نبی جن کی تاریخ

پوری سورۂ یونس پڑھ جائیے، ڈھنگ بدل بدل کر آپ کو بار بار یہی مضمون ملے گا کہ نفع و نقصان اللہ کے سوا کوئی اور نہیں پہنچا سکتا، اسی کی عبادت کرو اسی سے ڈرو۔ یہ کمزور اور ضعیف انسان جس کو بنانے والے ہی نے کمزور اور ضعیف بنایا ہے، اپنے ہر کام کو نفع حاصل کرنے یا نقصان سے بچنے کے لئے کرتا ہے، گویا نفع اور نقصان ہی اس کی زندگی کا محور ہے، اور جہاں اُس کو یہ معلوم ہوا کہ فلاں شخص سے نفع پہنچنے کی اُمید ہے، تو انجام سے غافل ہو کر اُس کا دامن اتنا مضبوط پکڑنا چاہتا ہے کہ اللہ کا دامن چھوٹنے کی بھی اس کو پروا نہیں رہتی، اور جب اس کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں شخص سے اُس کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس سے اتنا ڈرنے لگتا ہے کہ اللہ کے ڈر کی طرف اُس کا دھیان بھی نہیں جاتا، یہی انسانی کمزوری ہے، اس نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ وہ جس شخص کو نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھ رہا ہے وہ اپنے آپ کو نفع یا نقصان پہنچانے میں خود بے بس ہے، نفع حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کے لئے دوسروں کی طرف دیکھتا ہے، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جس شخص کو ہم بڑا با اختیار و مختار کل خیال کرتے ہیں، اور اس کو اپنا معبود مجازی کہنے سے بھی گریز نہیں کرتے، جب خود اس شخص کا کوئی ایسا معاملہ درپیش ہوتا ہے کہ جس میں وہ عزت یا ترقی کا خواہاں ہوتا ہے تو وہ بالکل بے کس و بے بس نظر آتا ہے اور اس کی تمام تدبیریں ذرائع اور وسائل بے سود ثابت ہوتے ہیں، تو پھر ایسے بے بس سے اپنی امیدوں کا دامن باندھنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے؟ انسان کو کمزور پیدا کرنے کے بعد پیدا کرنے والے نے اس کو جتا اور بتا بھی دیا کہ دیکھو تم اپنے آپ کو زوردار سمجھتے ہوئے بھی کمزور ہو۔

وسائل اور اسباب کے استعمال کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ ان کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، لیکن بنیادی عقیدہ یہ ہونا چاہیئے کہ اسباب خود کوئی اثر نہیں رکھتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ان میں اثر پیدا کر دیتے ہیں۔

توحید کے اثرات

قرآن کریم نے جس عقیدۂ توحید کی طرف بلایا ہے وہ انسان کے لئے ہر قسم کے کمالات و فضائل کا سرچشمہ اور ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان اپنی عقلی روحانی اور تمدنی ترقیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ بعض یورپین مصنفین نے لکھا ہے کہ اسلام کا عقیدۂ توحید ایک ایسا سیدھا سادہ عقیدہ ہے جو کہ فکر و عقل کے عین مطابق ہے، اسی لئے اس کو تھوڑی مدت میں قبولیت حاصل ہو گئی، اور عیسائیت کو اسلام کے مقابلے میں ایسی قبولیت نصیب نہیں ہوئی۔

صحابہ کرام کے دلوں میں توحید، خدا کی محبت اور اس کی ذات پر توکل و اعتماد کے جذبات موجزن تھے، جس کی وجہ سے اُن کے دل ہر قسم کے خوف و طمع کی آلائش سے پاک ہو گئے تھے جس نے ان کی ہمتوں کو بلند، ارادوں کو پختہ اور ان میں فخر و داری و شجاعت کا جوہر پیدا کر دیا تھا، وہ حق و انصاف پر ثابت قدم رہتے تھے۔ یہ توحید ہی کی برکت تھی کہ انھوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کے تختے اُلٹ کر رکھ دیئے، قوموں پر حکمرانی کی، انسانوں کو کاہنوں اور راہبوں کی غلامی سے چھڑا کر ایک قہار و جبار خدا کے سامنے جھکا دیا، ایک نئی تہذیب کی بنا ڈالی، علوم و فنون کو بام ترقی پر پہنچا دیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ جس کی نظیر تاریخ

ہم تک پہنچی، حضرت نوح علیہ السّلام ہیں، اور جب انھوں نے ان بت پرستوں کو ایک خدا کی طرف متوجہ کیا تو ان انانیت پرستوں نے پیغمبر کی دعوت کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا "قَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝" (انھوں نے آپس میں کہا کہ تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا، اور نہ وَدّ، سُواع، یَغوث، یَعوق اور نَسر میں سے کسی کو چھوڑنا)۔

حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت نوح علیہ السّلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ تھے۔ ان کی موت کے بعد اُن کے بیٹھنے کی جگہ پر ان کے نشانات قائم کئے گئے، ان بزرگوں کے نام پر ان جگہوں کے نام رکھے گئے، اور پھر کچھ عرصے کے بعد ان نشانوں کی پرستش شروع کر دی گئی، اس تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ بت پرست بتوں کو معبود نہیں سمجھتے تھے، بلکہ ان کی بت پرستی کا منشار اولیار اور انبیار کی تعظیم تھی، انھوں نے اپنے بتوں کو اُن ہی کی صورت پر تراشا اور ان کو سفارشی سمجھ کر اپنا سر نیاز ان کے سامنے جھکانے لگے، اس طرح وہ اصل میں ولی پرست یا نبی پرست تھے"[۱]

حدیثوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی امّت کی شفاعت فرمائیں گے، اور اللہ تعالیٰ آپ کی شفاعت قبول فرمائیں گے، لیکن یہ شفاعت اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوگی، اور اس کو اختیار رہے کہ وہ جس کو چاہے شفاعت کی اجازت دیدے۔

توحید کا مطلب سمجھتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنا چاہیئے کہ اسلام نے دنیوی

---

[۱] ملخص از "قرآن اور تعمیر سیرت" (تالیف ڈاکٹر میر ولی الدین پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی)

"شاہ روم کو جس وقت رومیوں کی شکست کی اطلاع ہوئی تو وہ انطاکیہ میں تھا، اس نے اپنے درباریوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، مجھے پہلے سے اندازہ تھا کہ یہ مسلمان ضرور تم کو شکست دے دیں گے۔ اس کے درباریوں میں سے کسی نے عرض کیا کہ آپ نے یہ اندازہ کیسے لگایا، شاہِ روم نے جواب دیا، میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگوں کو جس قدر زندگی پیاری ہے، ان لوگوں (مسلمانوں) کو اسی قدر موت عزیز ہے، اور تم لوگوں کو جس قدر دنیا مرغوب ہے اس سے زیادہ ان کو آخرت مرغوب ہے، اور جب تک مسلمانوں کی یہ حالت رہے گی وہ غالب رہیں گے، لیکن ایک ایسا وقت آئے گا کہ وہ تم جیسے ہو جائیں گے۔"[1]

حضرت خالد بن ولیدؓ کے فوجی سپہ سالار حضرت مثنیٰ بن حارثہؓ جب حیرہ میں ایرانی قائد زاذبہ کی فوجوں سے جنگ کر رہے تھے، تو اچانک دورانِ جنگ میں حضرت خالد بن ولید پہنچ گئے، مخالف فوج نے دبدبۂ خالدی سے مرعوب ہو کر میدانِ جنگ چھوڑ دیا، حضرت خالد بن ولیدؓ نے ان کے سامنے چند مطالبات پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ "اگر تم نے ان کو منظور نہ کیا تو ہم ایسے لوگوں کے ایک لشکر سے تمہارے اوپر چڑھائی کریں گے جو موت کو زندگی سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔" مخالف فوج نے یہ سن کر کہا کہ ہم لڑنا نہیں چاہتے، اور ایک لاکھ درہم پر صلح ہو گئی۔[2]

صحبتِ پیرِ روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش ۔۔۔ لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف
مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی ۔۔۔ اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگِ لاتخف

(اقبالؒ)

---

[1] فتوح الشام للازدی مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۱۲

[2] فتوح الشام للازدی مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۵۷

کے صفحات نے آج تک پیش نہیں کی۔

عقیدۂ توحید پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے عیسائی مورخ فلپ ہٹی نے لکھا ہے۔

" مذہبِ اسلام کی طاقت کا راز وہ بے لوچ توحید ہے جس میں کہ سادگی کے ساتھ ایک اعلیٰ اور برتر ہستی پر بڑے جوش و عقیدت کے ساتھ ایمان لایا جاتا ہے۔ اسی عقیدے نے اسلام کو ایک مذہبی جامہ پہنایا۔ جو آسودہ خاطری کہ مسلمانوں کو حاصل ہے وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں خودکشی کے واقعات شاذونادر ہی ہوتے ہیں[1]"

غزوۂ بدر کے موقعے پر توحید کے شیدائیوں کی کامیابی کا راز ظاہر کرتے ہوئے اسی مورخ نے لکھا ہے۔

"حد درجے کا انضباط اور موت کو حقیر و ذلیل سمجھنا، یہ دونوں ایسی خصوصیتیں ہیں کہ جو اس پہلے مسلح مقابلے کے موقعے پر ظاہر ہوئیں، اور جن کا نمایاں اثر ہونے والی تمام شاندار فتوحات پر پڑا[2]"

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اُس کو
ہلاکت نہیں موت اُن کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لَا تَذَر میں! (اقبالؒ)

اسی قسم کی ایک اور شہادت ہے جس کا ذکر "فتوح الشّام" میں کیا گیا ہے۔

---

[1] دی عربس صفحہ ۱۳۶ فلپ، کے ہٹی The Arabs: A Short History

[2] دی عربس صفحہ ۲۶-۲۷ P. 36.) The Arabs By Philip Hitti.

بہت تھوڑی مدت میں عروج کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اُنھوں نے قرآن حکیم سے صحیح تربیت حاصل کی تھی جس کی وجہ سے اُن کی عقل و فکر میں اس قدر پختگی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ نہ صرف دینی بلکہ دُنیوی امور کی قیادت و امامت کے لئے بھی خود کو تیار پاتے تھے، اور قوموں کی اندھی تقلید کو وہ عیب جانتے تھے، لیکن جب قیادت کی باگ ان لوگوں کے ہاتھ میں آئی کہ جو قرآن و اسلام کی روح سے ناواقف، اور توحید کی حقیقت سے ناآشنا تھے تو اسلامی حکومت کی بنیادیں کمزور پڑنے لگیں۔

توحید کے ماننے میں حکمت

اللہ تعالیٰ پر اس طرح ایمان کہ وہ اس عالم کا خالق اور ہمارے ظاہر و باطن سے آگاہ ہے، کرۂ زمین پر اگر ایک پتہ بھی ہلتا ہے تو اُس کو علم ہو جاتا ہے، ایک انسان کو بہت سی برائیوں سے بچا لیتا ہے جس جگہ کوئی انسانی قانون کام نہیں کر سکتا وہاں یہ عقیدہ بہت کام کرتا ہے کہ ایک ہستی ایسی ہے جو ہماری ہر نقل و حرکت پر نظر رکھتی ہے اور ہمارے دلی خیالات اور خطرات کا علم اس کو ہو جاتا ہے جس طرح ایک پیاسا سخت پیاس کی حالت میں اپنے آس پاس کی ہر چیز سے غافل ہو جاتا ہے، مگر پانی کی یاد سے جو کہ اس کے سامنے بھی نہیں غافل نہیں ہوتا، اسی طرح ایک مومن کو چاہیئے کہ وہ سب کچھ بھول جائے، مگر ایک لمحے کے لئے بھی خدا کو نہ بھولے تاکہ اس کا دینی شعور ہر وقت بیدار رہے، توحید کے ذریعے انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کا طریقہ قرآن کریم میں اختیار کیا گیا ہے۔

سیّد امیر علی نے لکھا ہے۔

توحید کے اثرات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر عبداللہ دراز مصری تحریر فرماتے ہیں۔

"لوگوں کا یہ کہنا کہ دین دار شخص ایک بے بس و مجبور کی طرح اپنی گردن ایک قاہر و جبّار قوت کے سامنے جھکا دیتا ہے، ایک حد تک ضرور صحیح ہے، لیکن وہ مایوس اور ناامید نہیں ہوتا، اور نہ اپنی عملی قوتوں کو بیکار کر دینا پسند کرتا ہے، وہ ہر وقت اپنے معبود سے آس لگائے بیٹھا رہتا ہے، اور کسی چیز کو محال اور ناممکن الحصول سمجھ کر اس کے حاصل کرنے کی جد و جہد کو ترک نہیں کرتا، ایک بالاتر ہستی کی خوشنودی اُس کے تمام کاموں کا مرکز ہوتی ہے، اور وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ اپنے آپ کو کسی دوسری طاقت کے سامنے جھکا دے[1]۔"

زندہ قوّت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی

آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام (اقبالؒ)

سیّد رشید رضا مصری نے اپنی کتاب "الوحی المحمدی" میں مشہور فرانسیسی مستشرق ڈاکٹر لیبون کی مندرجۂ ذیل عبارت نقل کی ہے۔

"ہر ترقی کرنے والی قوم کے علوم و فنون کی تکمیل تین نسلوں میں ہوتی ہے، پہلی نسل صرف تقلید کرتی ہے، دوسری نسل کچھ پچھلوں سے لیتی ہے، اور کچھ خود آگے بڑھتی ہے، اور تیسری نسل میں رائے اور فکر کی بنیادیں مستقل ہو جاتی ہیں، لیکن عرب قوم اس سے مستثنیٰ ہے، اس کی جس نسل میں علوم و فنون کا آغاز ہوا ہے، اُسی نسل میں تکمیل بھی ہو گئی ہے[2]۔"

علاّمہ سیّد رشید رضا ڈاکٹر لیبون کی اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد عربوں کے

---

[1] الدین صفحہ ۲۴۴ [2] الوحی المحمدی صفحہ ۱۵ (مطبوعہ مصر از علاّمہ سیّد رشید رضا مصری)

انسانیت کی ہدایت کے لئے انبیاء علیہم السّلام کے اُسوۂ حسنہ کی ضرورت اپنی جگہ پر مسلّم ہے، لیکن اس سے بھی وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔

انسان فطرتاً عاقبت اندیش ہے، وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے میں کل کا خیال آج سے زیادہ رکھتا ہے، اور حاضر کے واقعات سے زیادہ مستقبل کی امّیدوں اور تمناؤں میں اپنے دن گزارتا ہے، وقتی حالات سے متاثر ہو کر یا کسی اور وجہ سے کسی شخص کا کل کے متعلق نہ سوچنا اور بات ہے، ہر شخص اپنے تمام کاموں پر غور کر کے دیکھے کہ وہ آج کے لئے زیادہ ہوتے ہیں یا کل کے لئے؟ ان میں وقتی نفع کا خیال زیادہ رکھا جاتا ہے یا بعد میں آنے والے نفع کا، کھلی ہوئی بات ہے کہ کل کی فکر انسان کو آج کی فکر کے مقابلے میں زیادہ ستاتی اور پریشان کرتی ہے، اور اپنی تدبیروں سے وہ کل کو آج کے مقابلے میں بہت کچھ بنا بھی لیتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ دنیوی زندگی "آج" کے مقابل میں اُخروی زندگی "کل" کے سامان کا زیادہ اہتمام کرے تو اللہ تعالیٰ سے اس کا لگاؤ کس قدر بڑھ جائے۔ قرآن کریم کے ابتدائی حصّے میں یوم الآخرۃ (قیامت) پر یقین رکھنے والوں کو یہ خوش خبری دی گئی ہے کہ وہ صحیح راستے پر اور کامیاب ہیں، اللہ تعالیٰ کو دنیوی معاملات میں مالک و متصرّف سمجھنا تو قدرے دشوار ہے بھی، کیونکہ کچھ نہ کچھ ظاہری حجابات حائل ہیں، جو کمزور ایمان والے لوگوں کو حقیقت فہمی سے روک لیتے ہیں، اور ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ رزق دینے والا اللہ ہے یا زید و بکر، جو ظاہر میں لوگوں کو نوکری اور ملازمت دیتے ہیں، لیکن آخرت کا جو دن آنے والا ہے اُس میں تو یہ تمام حجابات اور بیچ کے وسائل اُٹھ

" قرآن کریم میں انسان کے اندرونی شعور اور وجدان سے اپیل کی گئی ہے۔" [1]

توحید اور عقیدۂ قیامت کا تعلق

توحید کی تکمیل عقیدۂ معاد یا عقیدۂ قیامت کے بغیر نہیں ہو سکتی، قرآن مجید میں "یوم الدّین" "یوم الفصل" اور "یوم الآخرۃ" کے الفاظ یوم قیامت ہی کے لئے استعمال کئے گئے ہیں، اس "یوم الدّین" کو ملائے بغیر نہ خدا کی ذات و صفات ہی کا تصور صحیح اور کامل رہتا ہے، نہ اس کائنات کے اندر انسان کے وجود ہی کے کوئی معنی نکلتے ہیں، نہ خالق و مخلوق میں لگاؤ پیدا ہوتا ہے، اور نہ دنیا پرستی کے مقابلے میں خدا پرستی اور دینداری کی زندگی کا کوئی صحیح مفہوم سامنے آسکتا ہے، عقیدۂ توحید اسی وقت نافع ہو سکتا ہے جبکہ تمام کاموں میں اللہ کی مرضی اور خوشنودی کا لحاظ رکھا جائے اور انسان یہ سمجھے کہ مستقبل میں اُس کی اس زندگی کا کوئی مآل کار اور انجام ضرور ہے، اس انجام و آخرت کے اچھے اور بُرے ہونے کا بہت کچھ مدار اس دستور العمل پر عمل کرنا یا نہ کرنا ہے جو انسان کے لئے خالقِ انسان نے بنایا ہے، اور مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس نظام و دستور کے مطابق زندگی گزارے، ورنہ وہ سزا کا مستحق ہوگا۔ آخرت کا خیال دنیا کی زندگی اور اس کے تمام معاملات میں خدا پرستانہ تعلق اور وابستگی رکھنے کا صحیح محرک بن سکتا ہے، اور اس کے بغیر خدا کے وجود کا اقرار صرف ایک فلسفہ بن کر رہ جاتا ہے۔

---

[1] دی اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۱۳۸

The Spirit of Islam
By Syed Ameer Ali

بدنامی کا ڈر ہوتا ہے یا سزا کا خوف ہوتا ہے، لیکن جب اس کو یہ یقین ہو جاتا ہے، اس کے جرم کی کسی کو خبر نہ ہوگی تو بڑی بے باکی سے وہ بڑے سے بڑا جرم کر گزرتا ہے، صرف یہ عقیدہ اور خیال انسان کو گناہ کرنے سے روکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ایک ایسا دن ضرور آئے گا کہ مجھ سے میرے تمام کاموں کی باز پرس ہوگی۔

"مسلمان کے دل میں اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم پر کامل اعتماد ہوتا ہے، اسی لئے مسلمانوں میں بمقابل دوسرے مذاہب والوں کے خودکشی کی بہت کم واردات پیش آتی ہیں، اسلام انسان کو نیکی کے ساتھ زندہ رہنا سکھاتا ہے، ترکِ زندگی کا حامی نہیں، حیات بعد از موت کا تصور آدمی کو افعالِ شنیعہ سے روکتا اور موجودہ زندگی کو پاک و صاف رکھنے پر مجبور کرتا ہے[1]۔"

عقیدۂ معاد بہت پرانا عقیدہ ہے

سید رشید رضا مصری نے لکھا ہے کہ "قدیم مصریوں اور دیگر قوموں کی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ انسان کے جسم اور روح کے ساتھ دوبارہ اُٹھائے جانے کا عقیدہ رکھتے تھے، لیکن جب ان لوگوں نے پیغمبروں کی تعلیمات کو بھلا دیا تو ان کا یہ عقیدہ بھی کمزور ہو گیا، اور کہنے لگے کہ انسان کا جسم بھی مرنے کے بعد محفوظ رہتا ہے، اور اسی جسم کے ساتھ حشر ہوگا، لیکن اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ موجودہ جسم فنا

---

[1] تاریخ اسلام پر ایک نظر صفحہ ۴۴ (تالیف مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب ایم اے صدر حیدرآباد اکاڈمی) (مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی)

جائیں گے، اور سوائے خدائے واحد وقہّار کے اس دن کسی کی حکومت بھی نہ ہوگی،
آج بھی دنیا میں آخرت پر ایمان رکھنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، لیکن
آخرت پر یقین کا جو اثر ان کی زندگی پر ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہے، اس سے یہی
اندازہ ہوتا ہے کہ جس درجہ آخرت پر یقین رکھنے اور ایمان لانے کا مطالبہ کیا
گیا ہے اس درجہ تک لوگوں کا ایمان نہیں ہے۔

یہ بات پورے طور پر ذہن میں جما لینا چاہیئے کہ توحید کے ساتھ جب تک
آخرت پر ایمان پختہ نہ ہوگا توحید کے اثرات ظاہر نہ ہوں گے اور نہ ایمانی قوت
ہی پیدا ہوگی، زندگی کے عملی میدان میں سویا ہوا ایمان سوئے ہوئے انسان کی
طرح کوئی حصہ نہیں لے سکتا، توحید کے سچے پرستار وہی تھے کہ جنھوں نے آخرت
کے دن کو اپنی زندگی کے ہر لمحے میں پیش نظر رکھا، اس دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز بھی
ان کو سیدھے راستے سے نہ ہٹا سکی، اور آخرت کے ساتھ ساتھ ان کی دنیا
بھی بن گئی، آج بھی توحید کے پرستاروں میں اسلامی زندگی کا کوئی نمایاں اور
اور اجتماعی انقلاب پیدا ہونے کی ایک ہی تدبیر ہے، وہ یہ کہ ایمان باللہ (توحید)
اور ایمان بالآخرۃ دونوں کو جگا یا جائے، دین کے نفع و نقصان کو دنیا کے نفع و
نقصان پر مقدم رکھا جائے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دین کے ادنیٰ سے ادنیٰ نقصان
کے مقابلے میں دنیا کا بڑے سے بڑا نقصان بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

یہ عقیدہ اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان گناہوں سے پورے
طور پر نہیں بچ سکتا، نہ عبادت میں دلچسپی لے سکتا ہے اور نہ جان و مال ہی قربان
کرسکتا ہے، مشاہدہ گواہ ہے کہ انسان بہت سے جرم اس لئے نہیں کرتا کہ اس کو

پیدا نہیں کیا گیا، اگر جزا و سزا اور اس کے اعمال کی باز پرس نہ ہو تو بھلے اور برے
نیکی اور بدی کا فطری امتیاز لغو اور انسانی زندگی تمام تر بے مقصد اور اس کے
تمام کام بے نتیجہ ہو جائیں۔

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ (المؤمنون)	کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کیا ہے، اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔

دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے۔

أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى (القیامۃ)	کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔

دوسری بات جو روز جزا کی ضرورت کے ثبوت میں قرآن کریم نے پیش کی ہے
وہ اللہ تعالیٰ کا منصف و عادل ہونا ہے، اگر انسانوں کے اچھے اور برے کاموں
پر جزا و سزا نہ ہو تو دونوں کا درجہ برابر ہو جائے گا، اور گناہ و ثواب، نیکی و
بدی کے کوئی معنی نہ رہیں گے، بلکہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ غیر منصف قرار پائے گا۔
اس دنیا میں بھی انسان کو کچھ نہ کچھ اس کے اعمال کی جزا و سزا ملتی ہے، لیکن یہ
بھی دیکھا گیا ہے کہ بہت سے گنہگار، سیہ کار اور ظلم و زیادتی کرنے والے دنیا میں
آرام و چین سے زندگی بسر کرتے ہیں، اور بہت سے اچھے اور نیک لوگ مصیبتیں اور
تکلیفیں جھیلتے ہیں، اس لئے یقیناً یہ موجودہ زندگی تمام اعمال کی جزا و سزا کی اصلی
جگہ نہیں ہو سکتی، اور کسی دوسری زندگی کا ماننا ضروری ہے، جہاں ہر شخص کو اس کے
کئے ہوئے کاموں کا پورا پورا بدلہ مل سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا میں عدالتوں
کے حکّام اپنے ناقص علم اور تجربے کے مطابق اچھوں اور بُروں کو ان کے اعمال کی

ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے دوبارہ جسموں کو اُٹھائے گا۔"[1]

توحید کے بعد اہلِ عرب عقیدۂ معاد یا عقیدۂ قیامت کا بڑی سختی سے انکار کرتے تھے، اور اس کے ماننے پر کسی طرح سے آمادہ نہ ہوتے تھے، جاہل عرب حیات بعد الموت (مرنے کے بعد پھر زندہ ہونا) اور خدا کے سامنے اپنے اعمال کی پرسش اور مواخذہ سے قطعاً لاعلم تھے، اسی لئے اُن کو اچھے اور بُرے کاموں میں صحیح تمیز نہ تھی، جس پر اخلاق و معاملات کا مدار ہے، قرآن کریم نے جگہ جگہ ان کے باطل عقائد کو نقل کر کے اس عقیدے کی صداقت و اہمیت پر زور دیا ہے، اور مختلف طریقوں اور مثالوں سے یہ سمجھایا ہے کہ اگر یہ نادان روزمرّہ کے حوادث و واقعات پر نظر کریں اور خالقِ عالم کی صحیح قدرت کا اندازہ کریں تو ان کو اس عقیدے کے مان لینے میں پس وپیش نہ رہے، لیکن یہ تو بات سمجھنا ہی نہیں چاہتے، اور اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

سیّد امیر علی نے عقیدۂ معاد کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کا حاصل یہ ہے کہ ہر زمانے کی مختلف انسانی نسلوں میں دوبارہ زندہ ہونے کے تصوّر کا پایا جانا اس عقیدے کی اہمیت ظاہر کرتا ہے۔[2]

قرآن اور عقیدۂ معاد

قرآن کریم نے اس عقیدے کی صداقت پر تمام دوسری دلیلوں سے قطع نظر کر کے عموماً دو باتوں سے استدلال کیا ہے، اوّل یہ کہ انسان بیکار اور بے مقصد

---

[1] الوحی المحمدی صفحہ ۱۵۶ [2] دی اسپرٹ آف اسلام صفحہ ۱۸۸

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ (البقرۃ)	یہ تحقیقی بات ہے کہ مسلمان اور یہودی اور نصاریٰ اور فرقہ صابئین، جو شخص یقین رکھتا ہو اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر اور اچھی کارگزاری کرے تو ایسے لوگوں کے لئے اُن کا حق الخدمت بھی ہے اُن کے پروردگار کے پاس، اور ان پر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں اور وہ مغموم نہ ہوں گے۔

یہ آیت جہاں ایک طرف اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہے کہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنا ہی ایمان کی بنیاد ہے، اور اسی سے اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل ہوتی ہے تو دوسری طرف اس باطل خیال کی بھی تردید کرتی ہے کہ جس طرح نجات کا انحصار یہودیت یا نصرانیت یا صابیّت پر نہیں ہے اسی طرح "مسلمانیّت" پر بھی نہیں ہے، اور کسی گروہ یا جماعت میں داخل ہونے کو پروانۂ نجات سمجھنا سخت نادانی ہے، کیونکہ نجات کے لئے عمل ایک ضروری شرط ہے۔

سیرت النبی میں ہے کہ آسمانی کتابوں کے ماننے والوں کے علاوہ فلسفہ اور سائنس دانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اس چیز کے امکان کو تسلیم کرتی ہے کہ ایک دن ایسا آسکتا ہے کہ یہ پوری دنیا تباہ و برباد ہو جائے۔

سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔

"ایک سبب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پورا نظامِ کائنات جذب و کشش کے ستون پر قائم ہے، اور فضائے ہستی کے یہ تمام سیّارے روز بروز کھنچتے چلے آتے ہیں، تو ایک دن وہ بھی آئے گا جب باہمی توازن باقی نہ رہے گا، اُس وقت

جزا و سزا دیتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ پوری دنیا کا مالک اور عالم الغیب اپنے صحیح علم کے مطابق لوگوں کو جزا و سزا دے کر اپنے عدل و انصاف کا ثبوت دے۔

عقیدۂ آخرت سے انکار کے نتائج

تاریخ بتاتی ہے کہ کسی قوم میں اخلاقی بگاڑ اور مادہ پرستانہ طرزِ عمل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس کے افراد کے دلوں سے توحید کا تصوّر اور آخرت کا خوف جاتا رہا ہو، یا اگر ہو بھی تو اس قدر دھندلا اور کمزور کہ اس قوم کے معاملات پر اس کا کوئی نمایاں اثر نہ ہو، اس مقام پر پہنچنے کے بعد یقیناً اس کی تمام تر توجہات کا مرکز یہی دنیا بن جائے گی۔

اسلام سے پہلے نجات کے لئے یہودیت یا عیسائیت کافی سمجھی جاتی تھی جس کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے۔

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا۔ (البقرۃ)	اور انھوں نے کہا کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ تو تم ہدایت یاب ہو۔

اس فریبِ نفس کا نشہ نزولِ قرآن کے وقت لوگوں پر بری طرح سے چھایا ہوا تھا، قرآن کریم نے ان سب کو یہ حقیقت سنا دی کہ نجات کا انحصار نہ تو مسلمانوں کے گروہ میں داخل ہونے پر ہے اور نہ یہود و نصاریٰ کے گروہ میں شامل ہونے پر، نجات کا مدار توحید، رسالت، اور یومِ آخرت پر سچّا اور پکّا ایمان لانے، اعتقاد رکھنے، اور اس کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔

نبوّت و رسالت

عرب کے لوگ عام طور سے نبوّت و رسالت کے قائل نہ تھے لیکن ان میں جو
لوگ دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے، یا یہودیوں اور عیسائیوں کا مذہب قبول کر چکے تھے
وہ عقیدۂ نبوّت کے قائل تھے، نبوّت کا انکار کرنے والوں کی سمجھ میں یہ بات نہ
آتی تھی کہ جب تمام انسان ایک جیسی بشری صفات رکھتے اور انسانی ضروریات
میں برابر ہیں تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اللہ کسی کو رسالت کے لئے چن لے، اور
دوسروں کو چھوڑ دے۔ یہودی اور عیسائی اس عقیدے کا انکار تو نہ کرتے تھے،
لیکن مذہبی تعصب کی بنا پر انھوں نے کسی نبی یا رسول کے لئے ایسی شرطیں
لگا دی تھیں کہ جن کا ثبوت خود ان کی کتابوں سے بھی نہ ملتا تھا، یہودی کہتے تھے
کہ اللہ نے نبوّت کی دولت صرف بنی اسرائیل کے گھرانے کے لئے مخصوص کر دی ہے،
یہی خیال عیسائیوں کا بھی تھا، یہود و نصاریٰ یہ بھی کہتے تھے کہ مذہبی عالموں اور

کرّے ایک دوسرے سے قریب ہوکر ٹکرا جائیں گے، اور یہ تصادم اُن کو چُور چُور کر دے گا۔

بہرحال اسبابِ طبعی کچھ بھی ہوں، مگر ایسا ہونا اہلِ سائنس کے نزدیک بھی امکان بلکہ وقوع کی امّید سے خالی نہیں[1]"

---

[1] سیرت النبی جلد ۴ صفحہ ۷۶۹

دوسری جگہ قرآن کریم میں ہے۔

اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ○ (الفاطر)	ہم نے آپ کو خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا حق کے ساتھ بنا کر بھیجا ہے، اور کوئی قوم ایسی نہیں کہ جس میں کوئی نہ کوئی ڈرانے والا نہ بھیجا گیا ہو۔

اسلام نے رسولوں کی شان یہ بتائی کہ وہ خدا کے احکام لوگوں کو پہنچاتے، ان کو پھیلاتے اور خود ان پر عمل کر کے دکھاتے ہیں۔ وہ احکام ان کی طرف سے نہیں ہوتے اس لئے پیغمبر کی اطاعت میں شخصیت پرستی کا سوال پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ان کی اطاعت اصل میں اللہ کی اطاعت ہے۔ ذیل کی آیت میں خود پیغمبر سے کہا جا رہا ہے کہ تم لوگوں سے یہ کہہ دو کہ میں بھی تم جیسا ایک انسان ہوں، بس فرق اتنا ہے کہ مجھ پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ○ (الکہف)	آپ لوگوں سے یہ کہہ دیں کہ میں تمھارا جیسا ایک انسان ہوں، (اتنا ضرور ہے کہ) مجھ پر وحی آتی ہے، کہ تمھارا خدا تو در اصل خدائے واحد ہی، پس جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی اُمید رکھتا ہو اُس کو چاہیئے کہ نیک کام کرے، اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

نبی کی ضرورت

جب انسان کی نجات کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر چلے،

پادریوں کو بھی یہ اختیارات حاصل ہیں کہ وہ دین کے قوانین بنائیں، عبادتیں مقرر کریں جس چیز کو چاہیں حلال کردیں اور جس کو چاہیں حرام کردیں۔ ان باطل عقاید کی وجہ سے یہ لوگ خدا سے دور ہوتے جارہے تھے، اور انسانوں کو اپنا رب سمجھنے لگے تھے، ظاہر ہے کہ اس قسم کے عقاید کی وجہ سے اگر ایک طرف خدا اور اُس کی رحمت سے انکار لازم آتا ہے تو دوسری طرف یہی عقاید انسانوں کے اعمال وافکار کو پستی کی طرف لے جانے والے ہیں، اور انسانوں کو انسانوں کا غلام بنانے والے ہیں[1]

قرآن کا انصاف

پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ نبوّت کسی ایک قوم اور خاندان سے مخصوص نہیں، اللہ تعالیٰ نے تو ہر قوم میں رسول اور نبی بھیجے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ۚ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ (النحل)

اور یہ واقعہ ہے کہ ہم نے (دنیا کی) ہر امّت میں کوئی نہ کوئی رسول ضرور پیدا کیا (تاکہ اس پیغام حق کا اعلان کردے) کہ اللہ کی بندگی کرو، اور سرکش قوتوں سے بچو۔ پھر ان امتوں میں سے بعض ایسی تھیں جن پر اللہ نے (کامیابی کی) راہ کھول دی، بعض ایسی تھیں جن پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ پس ملکوں کی سیر کرو اور دیکھو کہ جو قومیں (سچائی کی) جھٹلانے والی تھیں انھیں بالآخر کیسا انجام پیش آیا۔ (ترجمان القرآن)

---

[1] ملخص از الوحی المحمدی صفحہ ۱۶۲

عملی زندگی کا آئینہ سامنے رکھے بغیر سمجھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

انسانی تہذیب و شائستگی کو اوجِ کمال پر پہنچانے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اُن کو ہر انسان اپنے اختراعات یا الہام طبعی سے معلوم اور حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ خاص خاص صلاحیتوں کے انسان ان ضروریات اور مشکلات کے حل کی تدابیر سوچتے ہیں، جن کو مفکرّین، حکماء، یا اور اسی قسم کے ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور اگر اس قسم کی استعداد رکھنے والے لوگوں کے ساتھ امداد الٰہی اس طرح شامل ہو جائے کہ ان کی ہر بات کا ذمہ لے لے، اور جہاں عام انسانی دماغوں کی رسائی نہ ہو سکتی ہو وہاں الہام یا فرشتوں کے ذریعے ان کی رہنمائی کر دے تو ایسے لوگوں کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے، مصلح یا ریفارمر اور نبی میں جو فرق ہوتا ہے اُس کو آئندہ صفحات میں بیان کر دیا جائے گا، یہاں تو یہ سمجھانا ہے کہ نبی یا رسول کی ضرورت کیوں اور کس لئے پڑتی ہے؟ مختلف طریقوں سے اسی بات کے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

نظامِ ربوبیّت سے توحید پر اللہ تعالیٰ کے استدلال کو بیان کرنے کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اُس استدلال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو اللہ تعالےٰ نے نظامِ ربوبیت سے وحی و رسالت کی ضرورت پر کیا ہے تحریر فرماتے ہیں۔

" اسی طرح وہ نظامِ ربوبیت کے اعمال سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت پر بھی استدلال کرتا ہے جس ربّ العالمین نے تمھاری پرورش کے لئے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کر رکھا ہے، کیا ممکن ہے کہ اس نے تمھاری روحانی فلاح و سعادت کے لئے کوئی قانون، کوئی نظام، کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو؟ جس طرح تمھارے جسم کی ضرورتیں ہیں، اسی طرح تمھاری روح

اور صرف اسی کی عبادت اور اطاعت کو کسی اور کو شریک کیے بغیر اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرایئے، تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان یہ کیسے جانے کہ اللہ تعالیٰ کن کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور کن سے ناخوش ؟

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی کی مرضی سے واقف ہونے کے عقلاً دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں، یا تو وہ خود براہِ راست لوگوں کو اپنی مرضی سے مطلع کرے، یا اس نے جس کو اپنی مرضی سے مطلع کیا ہے وہ لوگوں کو بتائے ۔ مذہب نے بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی جاننے کے یہی دو طریقے بتائے ہیں، پیغمبروں کو تو اللہ تعالیٰ خود بذریعہ وحی اپنی مرضیات سے آگاہ فرماتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کو پیغمبروں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے احکام اور مرضیات کا علم ہوتا ہے ۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی مرضیات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کرے تو یہ پیغمبر کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی، اور مرضیات میں عبادات بھی ہیں اور معاملات بھی، جن کی توضیح اصولِ کلیّہ سے نہیں ہو سکتی، بلکہ پیغمبر کے اقوال و افعال سے ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر کسی ایک دینی شعار نماز یا زکوٰۃ کو لے کر چند لمحوں کے لئے اس کی ان تشریحات کو جو حدیث کے حوالے سے ہیں الگ کر دیجئے، اور صرف لغت کے ذریعے اُس کے مفہوم کو متعیّن کرنے کی کوشش کیجئے، بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے، اور کسی ایک چیز کا یقینی طور پر صحیح مفہوم متعین نہیں کر سکتے، اور اگر کوئی مفہوم متعیّن کر بھی دیا تو ویسا ہی مفہوم دوسروں کو متعین کرنے کا بھی اختیار ہے، نتیجہ یقیناً اختلاف کی صورت میں نمودار ہوگا، جو معاشرے کے لئے مفید ہونے کی بجائے نقصان دہ ہوگا یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ہو یا کوئی اور آسمانی کتاب، اس کا "اسوۂ حسنہ" یعنی پیغمبر کی

پیدا کرتا، لوگوں کی ذمہ داریاں اپنے سر لیتا، بہت سی پریشانیوں سے خود بچتا اور دوسروں کو بچاتا ہے، لیکن کس موقعے پر تعاون کیا جائے اور کب اور کس وقت نہ کیا جائے؟ اس کا سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے، بہت ضروری ہے کہ تعاون کے ایسے اصول کہ جن میں کسی خاص شخص، قبیلہ، قوم اور ملک کے نفع کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ اور کسی کی طرفداری نہ کی گئی ہو، مقرر و معیّن ہوں، اور ان اصول میں سب کا برابر فائدہ ہو، ظاہر ہے اس قسم کے اصول کہ جن میں اوپر لکھی ہوئی تمام باتوں کی پوری پوری رعایت کی گئی ہو کوئی انسان نہیں بنا سکتا، اس بات پر سب سے بڑی دلیل ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہے، انسان کچھ نہ کچھ طرفداری کر ہی جاتا ہے، جب انسانی عقل ایسے اصول اور قوانین نہیں بنا سکتی تو یہی کہنا پڑے گا کہ ایسا قانون ایک ایسی ہستی کی طرف سے ہو سکتا ہے کہ جس کا رشتہ تمام دنیا کے انسانوں سے بالکل برابر ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات بھی عقل میں نہیں اترتی کہ اللہ تعالےٰ ہر شخص کو وہ قوانین اور اصول بتائے، اس قسم کے مواقع پر بہترین طریقہ یہی ہوتا ہے کہ دیکھ بھال کر کچھ خاص لوگ چن لئے جاتے ہیں، جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لئے چن لیتا ہے وہ رسول اور نبی کہلاتے ہیں، اور وحی کے ذریعے سے وہ تمام باتیں جن کا پہنچانا بندوں تک ضروری ہے، ان لوگوں تک پہنچا دی جاتی ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ضرورتِ نبوّت پر بڑی مفصّل بحث کی ہے، اس میں سے کچھ حصّہ مختصر طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔

شاہ صاحب نے قرآن مجید کی آیت اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ

کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جسم کی نشو و نما کے لئے تو اس کے پاس سب کچھ ہو، لیکن روح کی نشو و نما کے لئے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو۔

اگر وہ ربّ العالمین ہے، اور اس کی ربوبیّت کے فیضان کا یہ حال ہے کہ ہر ذرّہ کے لئے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لئے کارسازی رکھتی ہے، تو کیوں کر باور کیا جاسکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لئے اس کے پاس کوئی سرچشمگی نہ ہو؟ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لئے آسمان سے پانی برسائے، لیکن ارواح کی پرورش کے لئے ایک قطرۂ فیض بھی نہ رکھے؟ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے، تو یہ اس کا قانون ہے کہ بارانِ رحمت نمودار ہوتی ہے، اور زندگی کی برکتوں سے زمین کا ایک ایک ذرہ مالا مال ہو جاتا ہے، پھر کیا ضروری نہیں ہے کہ جب عالمِ انسانیت، ہدایت وسعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے، تو اس کی بارانِ رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیامِ زندگی پہنچا دے؟ روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے؟ وہ کہتا ہے، وحی الٰہی ہے۔ تم اس منظر پر کبھی متعجب نہیں ہوتے کہ پانی برسا اور مردہ زمین زندہ ہو گئی۔ پھر اس بات پر کیوں چونک اٹھو کہ وحی الٰہی ظاہر ہوئی اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش پیدا ہو گئی۔"[1]

تعاون کے بغیر ایک کامیاب سماجی زندگی نہیں گزر سکتی، لوگ برائیوں کے روکنے اور بھلائیوں کے پھیلانے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں اور مدد کریں، اسی کو تعاون کہا جاتا ہے، تعاون کے ذریعے انسان رشتہ و قرابت کے تعلقات

---

[1] ترجمان القرآن صفحہ ۱۰۳ جلد اوّل (مولانا ابوالکلام آزاد)

جس طرح کہ دوسرے فنون کے اہلِ کمال۔ جب انسانوں کے معمولی پیشوں، جیسے بڑھئی، لوہاری وغیرہ جیسے کاموں میں مہارت حاصل کرنا ہر شخص کا کام نہیں بلکہ صرف وہ لوگ مہارت حاصل کرسکتے ہیں کہ جن میں اُن کے سیکھنے کی استعداد وصلاحیت ہوتی یا ذوق ہوتا ہے، تو اخلاق وروحانیات اور ملک وملّت کے مصالح وفوائد عامہ کا فن جس قدر اہم ہے اُس کو سمجھنا اور اس کے لئے مناسب قانون بنانا کیا ہر شخص کا کام ہوسکتا ہے؟[1]

فلاسفہ اور نظریۂ نبوّت

اسلامی فلاسفہ میں ابنِ سینا پہلے فلسفی ہیں جنھوں نے نبوّت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اثباتِ نبوّت پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس میں نبوّت کی نفسیاتی تحلیل کرتے ہوئے کہا ہے کہ تجربہ اور دلیل سے یہ بات ثابت ہے کہ انسان کو خواب میں بہت سی غیب اور مستقبل کی باتیں معلوم ہوجاتی ہیں، لوگوں نے خواب میں دیکھنے کے بعد ہونے والے واقعات کی خبر دی اور ان کے متعلق پیش گوئی کی جو صحیح ثابت ہوئی، انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو جو پاک وصاف دل رکھتے اور غیر معمولی روحانی قوت کے مالک ہوتے ہیں، جاگنے کی حالت میں بہت سی غیبی باتوں کا علم اسی طرح ہوجاتا ہے جس طرح کہ نیند کی حالت میں، یہ لوگ نبی کہلاتے ہیں۔ ابنِ سینا نے اپنے استدلال میں اس بات پر زیادہ زور دیا ہے کہ جب انسان نیند کی حالت میں غیب کی باتوں کو جان سکتا ہے تو بیداری کی حالت میں بھی اس قسم کی باتوں کا جان لینا ممکن ہوگا[2]۔

علّامہ ابن رشد اندلسی کہتے ہیں کہ جب یہ بات مسلّم ہے کہ روحانیت کی تکمیل عبد

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۸۲-۸۳ [2] فی الفلسفۃ الاسلامیہ صفحہ ۱۲۵ (تالیف ڈاکٹر ابراہیم مدکور)

(الرّعد) (بیشک آپ ڈرانے والے ہیں، اور ہر قوم کے لئے ہدایت کرنے والے ہوتے ہیں) نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ "جو قوت انسان کو برائیوں کی طرف لے جاتی ہے اُس کو دبانے اور کمزور کرنے، اور جو قوت نیکیوں کی طرف رغبت دلاتی ہے اُس کو ترقی دینے کے لئے اگرچہ انسان اپنی عقل و سمجھ کے ذریعے بھی طریقے سوچ سکتا اور تدبیریں نکال سکتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی لذتوں، حرص و طمع اور بے جا خواہشات کے ماحول میں رہنے کی وجہ سے انسان کی آنکھوں اور عقل پر ایسے پردے پڑ جاتے ہیں کہ اس کا فطری وجدان کمزور ہو جاتا ہے، اُس کو بُرے اور بھلے میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے، بلکہ بعض حالات میں تو بالکل فرق نہیں کر پاتا، جس طرح کہ بیماری کی حالت میں انسان کی زبان کا جب ذائقہ بدل جاتا ہے تو اس کو میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی کو ایسے رہنماؤں اور روحانی معلّموں کی ضرورت ہے جن کے احساس اور وجدان کا آئینہ بے داغ ہو، یہی روحانی معلّمین رسول اور نبی کہلاتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دنیوی کاموں کی صلاحیت اکثر و بیشتر انسانوں میں پائی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود ان ہی کاموں کو بہت اچھے طریقے سے انجام دینے کے لئے ایسے ماہرین کی ضرورت پڑتی ہے جو اپنے تدبّر، سیاست اور غیر معمولی ذہانت سے کام لے کر ان کاموں کو بڑی خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں، اور باہمی خلفشار دور کر کے صلح و آشتی اور سکون کی فضا پیدا کر دیں تو ایک قوم کی قوم بلکہ تمام دنیا کی اصلاح کے لئے ایسے اشخاص کی ضرورت کیوں نہ پڑے گی کہ جو ہر گروہ کی استعداد کو پیشِ نظر رکھ کر اس کے حقوق و فرائض کی تعیین کریں، جو لوگ ایسے اہم فریضے کو انجام دے سکیں اسی طرح کم ہیں،

تسلیم نہیں کیا ہے، بلکہ ایک کامیاب سماجی زندگی کے لئے نبی کے ہونے کو لازم اور ضروری قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ سیاست اور اخلاق کا بھی نبوّت سے گہرا تعلق ہے، نبی کو ایسی زبردست قوّتِ متخیلّہ عطا کی جاتی ہے کہ جس کی مدد سے وہ ان آسمانی الہامات کو قبول کرنے کے قابل ہو جاتا ہے جو مختلف اوقات میں حالات اور واقعات کی ضرورت کے مطابق اس کو ہوتے رہتے ہیں۔[۱]

علاّمہ عبدالکریم شہرستانی نے کہا ہے کہ نبوّت کوئی ایسی صفت نہیں ہے کہ جس کے حاصل کرنے میں نبی کے علم وکسب یا اس کی ذاتی استعداد کو کوئی دخل ہو بلکہ یہ اللہ تعالےٰ کا انعام ہے، جس سے وہ اپنے جس بندے کو چاہے سرفراز کرتا ہے۔[۱]

امام غزالیؒ کے نزدیک نبوّت ایک ایسی بصیرت اور نور کا نام ہے کہ جس کے ذریعے نبی ان باتوں کو جان لیتا ہے جن کو دوسرے لوگ اپنی عقل سے نہیں جان سکتے، امام غزالیؒ کہتے ہیں کہ نبوّت کا پایا جانا اور اس کا موجود ہونا بتاتا ہے کہ وہ ممکن ہے، اس کے موجود ہونے کی دلیل میں ان علوم کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ جن کو جاننے کا وحی الہٰی کے سوا عقلِ انسانی کے پاس کوئی اور ذریعہ نہیں ہے، مثلاً علمِ طب اور علمِ نجوم۔ کتنی ہی چھان بین کی جائے انسان اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ الہامِ ربّانی کی مدد سے اس نے ان علوم کو حاصل کیا اور دوسروں کو سکھایا، بعض ستارے ایسے ہیں کہ ان میں ایک ہزار سال کے بعد کوئی تبدیلی رونما ہوتی ہے، ان کے متعلق انسانی تجربہ کیا کام دے سکتا ہے، اور قریب قریب یہی حال دواؤں کی خاصیت کا بھی ہے۔[۲]

---

[۱] فی الفلسفۃ الاسلامیہ صفحہ ۱۱۹ [۲] المنقذ من الضلال صفحہ ۸۵

اور رب کے گہرے تعلق کے بغیر نہیں ہوسکتی تو نبی جو کہ روحانیت کا سرچشمہ ہوتا ہے ضرور اللہ تعالیٰ سے قریب ہوگا، اس قرب کی تعبیر ہم اتصال سے کرسکتے ہیں، اور قطعاً ضروری نہیں ہے کہ عوام الناس کے سامنے اس اتصال کی تفسیر کی جائے، یا اس کی کیفیت بیان کی جائے۔ اس قسم کی باتوں کا علماء اور فلاسفہ تک محدود رہنا اچھا ہے، کیونکہ ہر شخص سے اس کی عقل کے مطابق گفتگو کرنا چاہیئے۔[1]

ابن رشد اگرچہ فلسفہ کے دلدادہ تھے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے عقیدۂ نبوّت کے سمجھنے اور سمجھانے کو خاص لوگوں تک محدود رکھا، ان کا یہ طریقہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ تمام عقائد و احکام کو ایسے انداز میں کہ جو عام لوگوں کی سمجھ میں بھی آسانی سے آسکتا ہو، سمجھانا ضروری خیال نہیں کرتے، حالانکہ ابن رشد جیسے فلسفی کے لئے کہ جن کی فلسفہ دانی کا سکّہ یورپ کے فلاسفہ کے دلوں پر ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ صدیوں وہ ان کی پیروی کرتے رہے، کوئی عام فہم طریقہ اختیار کرنا زیادہ مشکل نہ تھا۔

علّامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب علم الکلام میں ابن رشد کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

" فرانس کے مشہور فاضل پروفیسر رینان نے ایک خاص کتاب ابن رشد کے حالات اور اس کی تصانیف اور فلسفہ پر چار پانچسو صفحوں میں لکھی ہے، اس کتاب میں اس نے تفصیل سے بتایا ہے کہ جرمن، فرانس وغیرہ کے فلاسفہ کتنی مدت تک ابن رشد کی پیروی کرتے رہے، اور اپنے آپ کو ابن رشد کی طرف منسوب کرتے رہے۔[2] "

فارابی نے نبوّت پر تفصیلی بحث کی ہے، انھوں نے نبوّت کو صرف ممکن چیز ہی

---

[1] فی الفلسفۃ الاسلامیۃ صفحہ ۱۲۹ [2] علم الکلام صفحہ ۹۶

حاصل نہیں کی جا سکتی ، یہ تو اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جس کو چاہے عطا فرمائے ، اس کے برخلاف حکمت ، جد و جہد اور بحث و نظر سے حاصل کی جا سکتی ہے ۔ نبی لغزش و خطا سے معصوم ہوتا ہے ، لیکن مصلح اور حکیم سے خطا سرزد ہو سکتی ہے ۔

ہالینڈ کے مشہور فلسفی سپینوزا (Spinoza) نبوت کے قائل ہیں ، وہ ایک کامیاب سماجی زندگی کے لئے مذہبی ہدایات کو ضروری سمجھتے ہیں ، اور فارابی کی طرح ان کا خیال بھی یہی ہے کہ پیغمبرانہ الہامات خواہ وہ کھلے ہوئے الفاظ اور صاف عبارت میں ہوں یا رمز و اشارے میں ، ان کی اہمیت کا تقاضہ ہے کہ نبی ایک قوی قوتِ متخیلہ رکھتا ہو ۔

عقیدۂ نبوت اور اسلام

پیغمبروں کی بعثت پر اعتقاد رکھنا ارکانِ اسلام کا ایک اہم رکن ہے ، ہر اس انسان پر جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے یہ عقیدہ رکھنا واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور قوموں میں نبی اور رسول بھیجے ، جنھوں نے اللہ کے بندوں کو ثواب کی خوش خبری دی اور عذاب سے ڈرایا ، ان کو اللہ کے احکام بتائے ، نیکی اور بدی کا فرق سمجھایا اور کہا کہ اللہ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے ان کو کرو ، اور جن سے بچنے کا حکم دیا ہے اُن سے پرہیز کرو ، جن پیغمبروں پر صحیفے اور کتابیں اتاری گئیں وہ ، اور جن پر نہیں اتاری گئیں وہ ، سب اللہ کے پیغمبر ہیں ۔[1]

کسی کو خدا کا پیغمبر ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُس کو سچا اور راست باز

---

[1] رسالۃ التوحید صفحہ ۸۴ (تالیف شیخ محمد عبدہ ، مطبوعہ مصر)

المنقذ من الضلال میں دوسری جگہ امام غزالیؒ لکھتے ہیں۔

"یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کو نیند کی حالت میں ہونے والے واقعات کا صاف طور پر علم ہوجاتا ہے، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ خواب کی تعبیر کسی مستقبل میں ہونے والے واقعہ کا پتہ دیتی ہے۔ خواب ایک نمونہ ہے کہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے یہ بات آسان کردی ہے کہ وہ نبوت کا مفہوم سمجھ سکیں۔"[۱]

شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریہ یہ ہے کہ نبوت کی رہنمائی صرف امور آخرت میں نہیں ہوتی بلکہ دنیوی معیشت کا سنوار اور اس کی اصلاح بھی ہدایات نبوی کی محتاج ہوتی ہے، انسان کی پوری زندگی کی اصلاح نبوت کا پہلا اور اہم مقصد ہوتا ہے۔

علامہ سید جمال الدین افغانی کو ایک مرتبہ جب کہ وہ قسطنطنیہ میں تھے وہاں کی کسی علمی مجلس میں تقریر کے لئے بلایا گیا، دوران تقریر میں کہیں سماجی زندگی کا ذکر آگیا، انھوں نے سماج کو ایسے جسم سے تشبیہہ دی جو مختلف اعضاء (افراد) سے مرکب ہوتا ہے اور ہر ہر عضو (فرد) اپنا کام کرتا ہے، اور اعضاء کا یہی عمل جسم (سماج) کی ظاہری زندگی کا پتہ دیتا ہے، لیکن درحقیقت جسم (سماج) کی زندگی روح سے ہوتی ہے، اور سماجی زندگی کی یہ روح نبوت و حکمت ہے، اور نبوت یعنی الہامی تعلیمات پر عمل کئے بغیر کوئی سماج پورے طور پر کامیاب نہیں ہوسکتا، سماج کی اصلاح کے لئے نبی اور حکیم کا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ بدن کے لئے روح کا ہونا، علامہ نے نبوّت اور حکمت میں فرق بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ نبوت انسانی جدوجہد سے

---

[۱] المنقذ من الضلال صفحہ ۵۳

ذریعہ اور دل کا نفاق بن کر رہ جاتا ہے

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا؟
دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک (اقبالؒ)

تاریخ گواہ ہے کہ پیغمبروں نے اپنے ماننے والوں کو صحیح علم اور پختہ یقین عطا کیا، آج کون نہیں جانتا کہ جھوٹ بری چیز ہے، چوری، ظلم، رشوت، کسی کی جیب کاٹنا وغیرہ بداخلاقی اور جرم ہے، لیکن اس کے باوجود لوگ ہر قسم کی بداخلاقی اور جرائم میں مبتلا ہیں۔ سزا بھگتنے کے بعد وہی شخص پھر جرم کرتا ہے۔ اگر صرف علم کافی ہوتا تو کم از کم چوری کی سزا کے بعد تو چوری چھوٹ جاتی اور وہ شخص دوبارہ جرم نہ کرتا، لیکن ایسا نہیں ہورہا ہے، معلوم ہوا کہ صرف علم کافی نہیں ہے بلکہ اس پر پورا یقین ضروری ہے، یعنی ایسا یقین جو انسان کو علم کے لئے آمادہ کردے۔ علم و یقین کے ساتھ ساتھ پیغمبر علم پر عمل کی ترغیب دیتے، اور غلط خواہشات کا مقابلہ کرنے کی طاقت بخشتے اور ضمیر انسانی کو روشن اور بیدار کر دیتے ہیں۔ حدیث کی مستند کتابوں میں ایک دو نہیں سینکڑوں واقعات ایسے موجود ہیں کہ جن کو پڑھ کر ایک سمجھدار شخص بخوبی اندازہ کرسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو علم و یقین کی دولت کے ساتھ بیداریٔ ضمیر کی وہ بے بہا دولت عطا کر دی تھی کہ جس نے مردہ انسانیت میں ایک بار پھر جان ڈال دی، آپ کے اسوۂ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر صحابۂ کرامؓ نے جوشِ توحید، اخلاق، ایثار، بہادری اور اسلامی رواداری کی ایسی ایسی مثالیں تاریخ کے صفحات پر ثبت کردیں کہ جن سے قیامت تک آنے والے انسان فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

جانیں، اس کو تمام اچھی صفات سے متّصف اور برائیوں سے بچا ہوا سمجھیں۔ کوئی انسان عبادت وریاضت سے نبوّت کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکتا، نبی انسان ہی ہوتا ہے، جو کھاتا، پیتا، چلتا پھرتا، شادی بیاہ کرتا اور نبوّت کے فرائض ادا کرنے کے علاوہ دنیا کے دوسرے جائز کاموں میں حصّہ لیتا ہے، بہ تقاضائے بشریت اس سے بھول بھی ہو جاتی ہے، لیکن منصبی فرائض کے ادا کرنے میں نہیں۔

پیغمبروں کی خصوصیات

پیغمبر کہتے ہیں کہ ہم اس دنیا کے بنانے والے، اور اس کی ذات وصفات کا صحیح علم عطا کرتے ہیں جو ہم کو اس دنیا کے خالق و مالک نے عطا کیا ہے، اور اس نے حکم دیا ہے کہ ہم وہ علم دوسرے انسانوں تک پہنچا دیں۔ پیغمبر توحید، انسان وکائنات کی تخلیق کا مقصد، آخرت کی زندگی، جزا وسزا اور ان تمام باتوں کو جن کا تعلّق انسان کی ہدایت وگمراہی سے ہے بتلاتے اور سمجھاتے ہیں۔ وہ تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور دوسرے علوم میں مہارت کا دعویٰ نہیں کرتے، لیکن اس کے باوجود اُن کے علم وحکمت کی باتیں سُن کر اچھے اچھے عقل مند حیران رہ جاتے ہیں، وہ فلسفے کی گتھیوں میں خود کو اُلجھانا ناپسند کرتے ہیں۔ اصولی تعلیمات میں تمام پیغمبر متّفق ہوتے ہیں اور اُن میں کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوتا، اس کے برخلاف فلاسفہ اور حکمار کے نظریات میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے، ان میں سے چند بھی کسی ایک بات پر بہت عرصے تک متفق اور قائم نہیں رہتے۔ انبیاء کرام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ صرف صحیح علم نہیں بلکہ اس پر یقین بھی عطا کرتے ہیں، کیونکہ یقین کے بغیر علم صرف دماغی تفریح کا

کا احتمال اس پر ہر وقت جائز ہے[1]

پیغمبرِ اسلام کی خصوصیت جامعیت تھی

دنیا بڑے اور قابل قدر لوگوں سے کبھی خالی نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ لوگ زندگی کے چند یا کسی ایک خاص شعبے میں کمال رکھتے ہوں، اور اسی شعبے میں ان کی زندگی قابلِ تقلید سمجھی جاتی ہو، سکندرِ اعظم اور نپولین کی زندگی میدانِ جنگ کے شائقین اور فاتحین کے لئے مفید مواد اور قابلِ تقلید مثالیں پیش کر سکتی ہے، گوتم بدھ کی زندگی، ان کی انمول نصیحتیں اور زرّیں اقوال بلاشبہ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ، فلاسفہ کے دماغوں کی جولانگاہ بن سکتا ہے، ہومر کی شاعری اور اس کی شاعرانہ زندگی شاعروں کے لئے یقیناً جذب و کشش کا سامان رکھتی ہے، قارون کی زندگی مال و دولت سے غیر معمولی محبّت کرنے والوں کے لئے قابل اتباع ہو کر اب بھی ان کی دولت میں اضافے کا باعث ہو سکتی ہے لیکن زندگی کے اور دوسرے شعبوں میں مذکورۂ بالا نمونے جامعیت سے خالی نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی پر اگر غائر نظر ڈالی جائے تو اس میں ایک ایسی جامعیت اور ہمہ گیری نظر آتی ہے جو آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرنے والوں کی ہر ہر قدم پر رہبری کرتی اور چراغِ ہدایت کا کام دیتی ہے۔ یہاں تعلیماتِ نبوی کی جامعیت بیان کرنے کا موقع نہیں ہے، سیرت کی مستند کتابوں میں اس کا کافی مواد موجود ہے،

---

[1] ترجمان السنّۃ صفحہ ۵۹ج (تالیف استاذ الحدیث مولانا بدرعالم میرٹھی)

عیسائی مورخ فلپ کے ہٹی (Philip K. Hitti) اپنی کتاب "دی عربس" میں پیغمبر اسلام کے اس کارنامے کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے جو آپ نے اپنی اخلاقی تعلیمات کے ذریعے انجام دیا لکھتے ہیں۔

" ملکِ عرب جو اب تک کسی انسانی ارادے کے سامنے نہ جھکا تھا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے جھکنے، اور مذہبِ اسلام میں شامل ہونے لگا، مشرکین عرب رفتہ رفتہ اپنے پرانے عقائد کو چھوڑ کر ایک برتر عقیدہ اور اعلیٰ ترین اخلاق کی طرف آنے لگے۔"[1]

رسول، مصلح اور ریفارمر میں فرق

" رسول اور ریفارمر میں بڑا فرق ہے، ایک ریفارمر اور مصلح کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے، ان ہی کی طرح وہ تعلیم حاصل کرتا ہے، پھر اپنی فطری صلاحیت و دلسوزی کی بنا پر قومی اصلاح کی خدمت انجام دیتا ہے، جب اس کی فہم و فراست ہمدردی و نیک نیتی کے اثرات قوم میں نمایاں ہوتے ہیں تو قوم کی نظروں میں وہ خود بخود ایک مصلح و ریفارمر کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے، مگر رسولوں کی تربیت صفت اجتباء و اصطفاء کے ماتحت ہوتی ہے، ان کی ہر نشست و برخاست، ہر قول و فعل کی قدرت خود نگراں ہوتی ہے، اور اس حفاظت کی وجہ سے ان کو صفت عصمت حاصل ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ ایک مناسب عمر پر وہ خود انھیں منصب اصلاح پر فائز کرتی ہے، ریفارمر عصمت کا مدعی نہیں ہوتا، غلطی

---

[1] "دی عربس" صفحہ ۲۸ The Arabs: A Short History by Philip K. Hitti.

گھر کی زندگی کے بعد باہر کی زندگی ہے، اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، اگر انسان کے سامنے صحیح اصول وضوابط نہ ہوں تو اس کے لئے یہ زندگی گزارنا بہت دشوار ہو جاتی ہے۔ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کی یہ ایک بڑی خصوصیت ہے کہ آپ نے سماجی زندگی کے کسی ایک پہلو کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ یہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ نہیں ہے۔ آج بھی اسلام کی تمام تعلیمات محفوظ و موجود ہیں۔ جس کا دل چاہے قرآنِ کریم اور احادیث نبوی اُٹھا کر دیکھ لے۔

عیسائی مورّخ واشنگٹن اروِنگ (Washington Irving) نے اپنی کتاب "لائف آف محمّد" میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے لکھا ہے۔

"محمّد (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے دوسروں کے ساتھ معاملات اور برتاؤ میں انصاف اور خلوص سے پیش آنے کی بہت زیادہ تاکید کی ہے[1]۔"

"آج انسانوں کا کونسا ایسا طبقہ ہے کہ جس پر آپ کا براہِ راست یا بالواسطہ احسان نہیں ہے؟ کیا مَردوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کو مردانگی اور آدمیّت کی تعلیم دی، کیا عورتوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے اُن کے حقوق بتائے اور ان کے لئے ہدایتیں اور وصیّتیں فرمائیں اور آپ نے فرمایا کہ جنّت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ کیا کمزوروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے اُن کی حمایت کی، اور فرمایا کہ مظلوم کی بد دعا سے ڈرو کہ اُس کے اور خدا کے درمیان

---

[1] دی لائف آف محمّد صفحہ ۴۷ The Life of Mahomet By Washington Irving P. 47

صرف اشارات کو کافی سمجھا گیا، لیکن مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر آپ کی تعلیمات کی جامعیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ میدان جنگ میں پہنچ کے بعد انسان کے جذبات بیحد مشتعل ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ہر طرح سے دشمن کو نقصان پہنچا کر اس کو تباہ و برباد کر دیا جائے، آپ نے ایسے سخت اور نازک موقعے پر بھی زیادتی کو روکنے کے لئے جامع قوانین بنائے اور سب سے پہلے خود ان پر عمل کر کے دکھایا۔

فتح مکہ کے موقع پر پیغمبر اسلام اور مسلمانوں نے مشرکین عرب کے ساتھ جو ہمدردانہ سلوک کیا اس کو سراہتے ہوئے عیسائی مورخ فلپ ہٹی نے لکھا ہے۔

" فتح مکہ کے موقع پر مشرکین کے ساتھ برتاؤ میں جس عالی ظرفی اور رواداری کا ثبوت دیا گیا تاریخ مشکل ہی سے ایسے فاتحانہ داخلے کی نظیر پیش کر سکتی ہے[1]"

انسان کی گھریلو زندگی ہو یا گھر سے باہر کی، کچھ ایسے اصول و ضوابط چاہئے ہے جو خود اس کی اور اس کے تمام متعلقین کی زندگی کو منظم کر کے قلبی سکون بخشنے والے ہوں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لئے رحمت بن کر آئے تھے اور اس کے ثبوت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی تنظیم کے لئے آپ نے ایسے اچھے اصول بتائے کہ ان پر عمل کرنے کے بعد یہ زندگی بڑی اچھی طرح گزر سکتی ہے۔ گھریلو زندگی بھی ایک چھوٹا سا سماج ہے اور بڑے سماج یعنی گھر سے باہر کی زندگی کے لئے انسان بہت کچھ اپنے گھر ہی میں سیکھتا ہے، گھر کے ہر فرد کے لئے، وہ چھوٹا ہو یا بڑا، عورت ہو یا مرد، خادم ہو یا مخدوم، آپ نے حقوق و فرائض مقرر کر دئے،

---

[1] دی عربس صفحہ ۲۸-۲۹

The Arabs: A Short History by Philip K. Hitti.

مولانا ابوالکلام آزاد نے[1] "رب العالمین" کی تفسیر میں لفظ ربوبیت کی جو تشریح ترجمان القرآن میں کی ہے اُس کا کچھ حصّہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"عربی میں ربوبیت کے معنی پالنے کے ہیں، لیکن پالنے کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں لینا چاہیئے، اسی لئے بعض آئمہ لغت نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔ ھو انشاء الشیٔ حالاً فحالاً الیٰ حد التمام۔ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق، اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ اپنی حد کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے، یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا، جود ہوگا، احسان ہوگا، لیکن وہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے لئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں، ان سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز یہ ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت و شفقت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہوگا، ربوبیت نہیں ہوسکتا۔"

نئے مذہب کی تلاش

ہر پرانی چیز سے اُکتا جانے والا انسان جو اس صفت کے ساتھ روشن خیالی کی صفت سے بھی متصف ہے، اب اس تلاش میں ہے کہ کوئی بین الاقوامی مذہب ہونا چاہیئے۔ بین الاقوامی مذہب کی خود ساختہ خصوصیات اس خیال کے لوگوں

---

[1] ترجمان القرآن ج ۱ صفحہ ۱۱

کوئی پردہ نہیں، خدا کہتا ہے کہ میں شکستہ دلوں کے پاس ہوں، کیا طاقتوروں اور حکمرانوں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے ان کے حقوق و فرائض بھی بتلائے اور حدود بھی بتلائے۔ انصاف کرنے والوں اور خدا سے ڈرنے والوں کو بشارت سنائی کہ بادشاہ منصف رحمت کے سائے میں ہوگا، کیا تاجروں پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے تجارت کی فضیلت اور اس پیشے کی شرافت بتائی، اور خود تجارت کر کے اس گروہ کی عزّت بڑھائی، کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں اور راست گفتار اور دیانت دار تاجر قریب قریب ہوں گے، کیا آپ کا مزدوروں پر احسان نہیں کہ آپ نے تاکید فرمائی کہ مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دے دو، کیا جانوروں تک پر آپ کا احسان نہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہر وہ مخلوق جو جگر رکھتی ہے اور جس میں احساس و زندگی ہے اُس کو آرام پہنچانا اور کھلانا پلانا بھی صدقہ ہے (فِیْ کُلِّ ذَاتِ کَبِدٍ حَرّیٰ صَدَقَۃٌ) کیا ساری انسانی برادری پر آپ کا احسان نہیں کہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر آپ شہادت دیتے تھے کہ خدایا تیرے سب بندے بھائی بھائی ہیں (اَنَا شَہِیْدٌ اِنَّ الْعِبَادَ کُلُّھُمْ اِخْوَۃٌ) کیا ساری دنیا پر آپ کا احسان نہیں؟ سب سے پہلے دنیا نے آپ ہی کی زبان سے سُنا کہ خدا کسی ملک و قوم، نسل اور برادری کا نہیں، سارے جہانوں اور دنیا کے سب انسانوں کا ہے، جس دنیا میں آریوں کا خدا، یہودیوں کا خدا، مصریوں کا خدا، ایرانیوں کا خدا کہا جاتا تھا وہاں (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ) کی حقیقت کا اعلان ہوا اور اس کو نماز کا جزو بنا دیا گیا۔[۱]"

---

[۱] ماہنامہ فروغ اردو لکھنؤ صفحہ ۶۴-۶۵ (مقالہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی)

پروفیسر محمد مجیب مسلمانوں کی تہذیب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ساتویں صدی عیسوی میں جو تہذیبیں موجود تھیں، اور اُن سے پہلے کی جتنی تہذیبیں تھیں وہ سب نسلی اور ملکی تھیں، ان کا بھی ایک دوسرے پر اثر پڑا، اس وجہ سے کہ بادشاہوں کے حوصلے نسل، ملک اور مذہب کی حد کے اندر نہیں رہے۔ لیکن فتح اور زبردستی تنگ نظری کو نہ مٹا سکی، اور کوئی قوم اپنے دل اور اپنے دھرم میں دوسروں کے لئے جگہ نہ کر سکی۔ مسلمانوں کو سکھایا گیا تھا کہ ہر انسان کو خدا کا بندہ اور ساری انسانی جماعت کو ایک برادری جانیں، جو ان سے دوستی کرنا چاہیں اُن سے دوستی کریں، اپنے آپ کو سلامتی کا ذمہ دار بنائیں، ہر مذہب اور ہر قوم کا ادب کریں، اور علم حاصل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں[1]۔"

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ لوگوں کا دماغ کسی نئے بین الاقوامی مذہب کی طرف گیا کیسے؟ جبکہ مذہب اسلام جس کی تکمیل خاتم النبیین محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے ہوئی اپنی پوری درخشانی اور تابانی کے ساتھ موجود ہے، جو روزِ ازل سے انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اُن کو دنیا اور آخرت کی طرف بُلا رہا ہے۔

مولانا گیلانی نے یہ ثابت کرتے ہوئے کہ محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لائے بغیر توحید کے مطالبے کی تکمیل ممکن نہیں، لکھا ہے۔

"اسی لئے میں یہ کہتا ہوں کہ اگر دنیا کے تمام مذہبی اور دینی وثیقوں پر وہ حادثہ نہ بھی پیش آتا جس کی وجہ سے کسی پیغمبر کا پیغام یا کسی قوم کا آسمانی دستور اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہا ہے، جس کا دوسروں ہی کو نہیں بلکہ خود ان پیغمبروں کے

---

[1] دنیا کی کہانی صفحہ ۱۳۹ ۔ ۱۴۰

گو کبھی کسی مذہب میں دکھائی دیتی ہیں، اور کبھی کسی مذہب میں۔ حیرت کی بات ہے کہ بین الاقوامی مذہب، اور انسان اس کے اصول مقرر کرے! آج تک جو جو بین الاقوامی چیزیں انسان نے بنائی ہیں اُن سے انسانوں یا انسانیت نے کب اور کتنا فائدہ اُٹھایا ہے؟ بین الاقوامی مذہب تو صرف اُسی ہستی کی طرف سے ہو سکتا ہے جو ربّ العالمین ہے، جس کا تعلق دنیا کے ہر انسان سے بالکل برابر ہے، جس کے یہاں قومی اور نسلی کوئی تقسیم نہیں، لیکن تسلیت، وطنیت اور قومیت کا پجاری بھلا کسی ایسے مذہب کو مان کب سکتا ہے کہ جس میں اس کو ان کے پوجنے کا موقع ہی نہ ملے، اور باتوں کو جانے دیجئے جو انسان کالے اور گورے ہونے کی بنا پر انسانوں کے حقوق میں تفریق کرے، اور کالے کو محض کالا ہونے کی وجہ سے انسان نہ سمجھے کیا وہ اور بہت سی من گھڑت باتیں نکال کر انسانوں کو جانوروں کی صف میں لا کر نہ کھڑا کر دے گا۔ حالانکہ کالا اور گورا ہونا انسان کے اپنے بس میں نہیں، اگر کوئی وجہ تفریق بتلانا ہی تھی تو ایسی بتلائی ہوتی کہ جس میں تھوڑی بہت تو معقولیت ہوتی۔ بین الاقوامی مذہب وہی ہو سکتا ہے جو قوموں کے حقوق کی نہیں بلکہ انسانوں کے حقوق کی حفاظت کرتا ہو، اور وہ مذہب اسلام ہے کہ جس کی بنیادی تعلیمات کی روح آدم، نوح، ابراہیم، اسمٰعیل، داؤد، موسیٰ، عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات میں کارفرما ہے۔ اسلام بین الاقوامی مذہب ہے کہ کبھی نہ بدلنے والے اصول اور زمانہ کے تقاضے کے مطابق لچک جانے والی فروع رکھتا ہے، یہاں بین الاقوامی مذہب کا مطلب قوموں کا مذہب نہیں بلکہ ان انسانوں کا مذہب ہے کہ جو بعد میں مختلف ضرورتوں کے تحت قوموں میں منقسم ہو گئے۔

یہ بات کسی قدر الجھن میں ڈال دیتی ہے کہ اسلامی توحید کا تقاضہ تو یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کی اطاعت کی جائے، پھر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو کچھ رسول کہے اُس کو ماننا اور عمل کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم نے اس بات کو اس طرح صاف کیا کہ نسبتِ رسالت کے بعد رسول بندوں اور خدا کے درمیان خدائی پیغامات پہنچانے کا ایک واسطہ ہوتا ہے، اور اس کی اطاعت اور محبّت خدا ہی کی محبّت و اطاعت ہو جاتی ہے۔

وَمَن يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ (النسار)	جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی

بظاہر یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ رسول کی اطاعت اور توحید کی سمت مختلف ہے، مگر حقیقت میں رسول کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے، بلکہ رسول کی اطاعت اور محبّت کے بغیر خدا کی محبّت و اطاعت کا کوئی اور راستہ ہی نہیں ہے اور اسی طرح رسول کی اطاعت کا دائرہ خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو جائے لیکن اس کا اصل مرکز خدا ہی کی ذات پاک رہتی ہے۔

ماننے والوں اور ان مذاہب کی پیروی کرنے والوں کو بھی اعتراف ہے، بہرحال اگر یہ صورت نہ بھی پیش آتی جب بھی قوموں نے جن بنیادوں پر اپنے رسولوں اور پیغمبروں کو خدا کا نمائندہ اور خدا کی مرضی ظاہر کرنے والا مانا ہے، جب وہ ساری باتیں بالوجہ الاتم محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات والاصفات میں پائی جارہی ہیں تو پھر آپ کی اور آپ کے دعوے کی تکذیب کی عقلاً وفطرۃً کسی کے پاس کیا توجیہہ ہوسکتی ہے ؟ قرآن میں آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کی دلیلوں میں اس دلیل کا ذکر بھی،

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ (الاحقاف) | آپ کہہ دیجئے نہیں ہوں میں کوئی رسولوں میں انوکھا۔

وغیرہ جیسی آیتوں میں کہا گیا ہے "

اسی سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے خاتم النّبیّین ہونے کا ذکر مولانا نے اس طرح کیا ہے۔

" میرا مطلب یہ ہے کہ منجملہ اور خصوصیتوں کے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی نبوّت کی ایک بڑی خصوصیّت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ آخری نبوّت ہے، اور آپ کے بعد پھر کوئی نبی نہیں آئے گا، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ آپ کے بعد نبوّت کا جو دعویٰ بھی کیا جائے گا اس کی تصدیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے دعویٰ نبوّت کی تکذیب ہوگی[1] "

---

[1] الدّین القیّم صفحہ ۲۲۷ - ۲۲۹ (مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی)

ذمہ داری لے لی اور فرمایا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ٥ (الحجر)	بلاشبہ خود ہم نے الذکر (یعنی قرآن کہ سرتا پا نصیحت ہے) اتارا ہے، اور بلاشبہ خود ہم ہی اس کے نگہبان ہیں۔ (ترجمان القرآن)

دوسری جگہ قرآن کریم کے ہمہ گیر ہونے کو ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ لِمَن شَاءَ مِنكُمْ أَن يَسْتَقِيمَ (التکویر)	بس یہ تو دنیا جہان والوں کے لئے ایک بڑا نصیحت نامہ ہے (بالخصوص) ایسے شخص کے لئے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے۔

سورۃ الزمر میں قرآن کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ اس کی عبارت سیدھی سادی ہے۔

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ (الزمر)	عربی قرآن ہے اس میں ذرا پیچیدگی نہیں، تاکہ یہ لوگ پرہیزگار بن جائیں۔

پیغمبر اسلام کا معجزہ قرآن ہے

دوسرے پیغمبروں نے اپنی اپنی اُمتوں کے سامنے جو حیرت انگیز معجزے پیش کئے، ان کی چمک اور تابانی وقتی تھی، لیکن ان ہی پیغمبروں میں سے ایک ایسا پیغمبر بھی آیا جو وقتی اور عارضی نہیں، بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ قرآن مجید لے کر آیا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری دین اور ایسی آخری کتاب لے کر

قرآن

قرآن کریم کی نمایاں خصوصیات

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے پیغمبروں کی ایک بڑی تعداد اس دنیا میں بھیجی، ان برگزیدہ ہستیوں کو اللہ تعالیٰ نے مختلف قوموں اور ملکوں میں ایک خاص زمانے تک کے لئے بھیجا، اس لئے ان کا پیغام بھی محدود اور وقتی تھا، لیکن اسلام قیامت تک آنے والے انسانوں کا دین ہے، اور ابد تک سارے عالم کی ہدایت کے لئے آیا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کا پیغام تمام دنیا کے لئے ہے اور ابدی ہے، وہ صرف اخلاق اور روحانیت کا درس نہیں دیتا، بلکہ دنیوی اور اُخروی زندگی کا مکمل پروگرام اور لائحہ عمل پیش کرکے اس پر عمل کرنے والوں کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ضامن بھی بنتا ہے۔

قرآن کریم کی اس اہمیت کی بنا پر خود اللہ تعالیٰ نے اُس کی حفاظت کی

تاثر کی بنا پر تثلیث پرستی سے نفرت قائم ہونے لگی، اور ان میں پروٹسٹنٹ فرقے کی بنیاد پڑی جس کا مشن تثلیث کا رد اور توحید کا اثبات تھا۔[1]

کارلائل (Carlyle) نے قرآن کریم کے متعلق جو خیال ظاہر کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے۔

قرآن کی عظمت کرنے والے اور اس کو احترام کی نظر سے دیکھنے والے مسلمانوں کی تعداد انجیل کی عظمت کرنے والے عیسائیوں سے کہیں زیادہ ہے، مسلمان قرآن کو برابر پڑھتے رہے ہیں، اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں[2]۔

اس وقت تک علم تاریخ نے یقینی طور پر یہ بات متعین نہیں کی کہ کون سی کتاب خدا کی طرف سے نسل انسانی کو سب سے پہلے ملی؟ اور کب ملی؟ قرآن کریم نے اتنا ضرور بتایا کہ جب سے انسان نے اس زمین پر قدم رکھا اُس کو سیدھا راستہ (الصراط المستقیم) دکھانے کے لئے برابر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نمائندے آتے رہے جنھوں نے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر آسمانی تعلیمات بڑی مستعدی اور سرگرمی سے پھیلائیں۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ (النساء)	(اے پیغمبر) ہم نے تمھاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوح پر اور ان نبیوں پر جو نوح کے بعد ہوئے بھیجی تھی۔ (ترجمان القرآن)

---

[1] تعلیمات اسلام اور مسیحی اقوام صفحہ ۷۷ (تالیف مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند)

[2] اون دی ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ صفحہ ۸۴

On the Heroes and Hero-worship, Carlyle P. 84

اس دنیا میں تشریف لائے جس نے اخوّت و مساوات، اور عدل و انصاف سے انسانی دلوں کو معمور کر کے مغرب کی قوموں کو مشرق سے ملا دیا، اونچ نیچ، ذات پات، شاہی و گدائی، غرض ہر قسم کا تفرقہ مٹا کر قرآن والوں کی ایک برادری بنا دی، جو مسلمان کہلائے اور جنھوں نے قرآن کریم کی ایسی عالم گیر تبلیغ کی کہ جس کی نظیر دوسرے مذاہب میں نہیں ملتی۔ مسلمانوں کی عالم گیر تبلیغ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا محمد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں نے اپنے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُن جامع اور فطری تعلیمات کو شائع کرنے اور دنیا میں انھیں پھیلا دینے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، کوہ و بیابان، دریا اور سمندر، حاضرہ اور بادیہ، شہر اور دیہات میں سے کوئی خطّہ نہ چھوڑا جہاں قرآن کی آواز بلند ہو کر نہ پہنچائی ہو، کوئی قوم ایسی نہ چھوڑی جسے اپنے علوم و فنون سے آشنا بنانے کی سعی نہ کی ہو، اُن کا علم بت پرستوں کی طرح کسی خاص فرقہ یا خاندان کی میراث نہ تھا، بلکہ سارے عالم کا ترکہ تھا، اس لئے تمام ممکن وسائل تبلیغ کے ذریعے انھوں نے انتہائی جوش کے ساتھ عالم میں قرآنی نور پھیلایا، اُن کی بے شمار تصنیفوں، اُن کے خطبوں، اُن کے لیکچروں، اُن کے شخصی اور اجتماعی امر بالمعروف، اور ان کی قائم کردہ تعلیم گاہوں کے ذریعے دنیا کے ہر ہر گوشے اور ہر ہر سنجیدہ طبقے میں اُن کے علم کا آوازہ پہنچا، انھوں نے دورِ خلافت اندلس میں اسلامی یونیورسٹیاں قائم کیں، جن میں عیسائی رعایا کو بھی تحصیلِ علم کا اسی طرح اذنِ عام تھا جس طرح مسلم رعایا کو، قومی حیثیت سے عیسائی رعایا اسلامی تعلیمات سے باخبر ہوئی، حتیٰ کہ عیسائیوں میں اسلام کی توحید خیز تعلیمات سے

دستور العمل بھی ایک ہی ہونا چاہئے، یعنی ایسا دستور العمل کہ جس کے اصول میں یکجہتی ہو، شکل وصورت، رنگ ونسل، زمان ومکان، آب وہوا اور زبان کے بدل جانے سے انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔

مسلمانوں کا یہ پکا عقیدہ ہے کہ قرآن آسمانی کتاب ہے اور اس پر مذہب اسلام کی عمارت قائم ہے، قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا زندہ نشان، اور اسلام کی حقانیت کا روشن آفتاب ہے، اسلام کے احکامات اور ہدایات کا سرچشمہ اور منبع بھی قرآن ہے، اور اسی کی تبلیغ کے لئے آپ کو دنیا میں بھیجا گیا۔ اس کتاب کے آخری پیغام ہونے کا تقاضہ یہی تھا کہ اس کی حفاظت کی پوری پوری ضمانت اور ذمہ داری لی جاتی۔ قرآن کریم کی وہ آیت جس میں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، اوپر گزر چکی ہے، اس وعدے کو پورا ہوتے ہوئے دنیا والوں نے دیکھ لیا کہ کس شان سے اس کو پورا کیا گیا، اور پورا کیا جا رہا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن خصوصیتوں کے ساتھ اس کتاب کو دنیا کے حوالے کیا تھا انہی خصوصیات کے ساتھ ساڑھے تیرہ سو برس سے زائد کا عرصہ ہوا مسلمانوں میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی چلی آرہی ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی نہ قرآن مسلمانوں سے جدا ہوا اور نہ مسلمان قرآن سے۔ پیغمبر اسلام کے تمام اقوال و افعال کا مجموعہ مسلمانوں نے جس عرق ریزی، جدوجہد، احتیاط اور اہتمام سے تیار کیا، اس کی تنقید وتصحیح کی، اور کوئی دوسرا مذہب اپنے بانی کی ایسی مکمل تاریخ نہ پیش کرسکا جس پیغمبر کے ماننے والے اپنے پیغمبر کے اقوال وافعال کی حفاظت میں خود ہی آپ اپنی نظیر ہوں، وہ آسمانی کتاب کی حفاظت میں کیسے کوتاہی اور غفلت برت سکتے

دین، مذہب، کیش، اور دھرم وغیرہ الفاظ کے معنی میں لغت واصطلاح کے اعتبار سے جو فرق بھی ہو اس سے یہاں بحث نہیں، لیکن ان الفاظ کا اجمالی مفہوم اگر "انسانی زندگی کا خدائی دستور العمل" لیا جائے تو اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسان اپنی ابتدائے آفرینش ہی سے زندگی کے قدرتی یا خدائی دستور العمل کا پابند بنایا گیا ہے، وہ دستور العمل انسانیت کا ایک مشترکہ موروثی ترکہ ہے، اور اس کے اصول انسانیت کے ہر دور میں ایک ہی رہے ہیں، البتہ ضرورت زمانہ اور حالات کے لحاظ سے فروع میں تبدیلی ہوتی رہی۔ یہ واقعہ ہے کہ قدرت کے عطا کئے ہوئے اس آئین و دستور کی حفاظت میں انسانوں نے ہر زمانے میں غفلت ولاپروائی برتی، اور بہت سی من گھڑت رسوم اور پابندیوں میں خود کو اُلجھا لیا، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغامبر بھیجے، تاکہ انسانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے پرانے دستور کی اہم دفعات یاد دلاتے رہیں، اور بدلنے والے حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے فروعی تبدیلی جائز رکھیں۔

جن پیغمبروں یا آسمانی کتابوں کا ذکر سب سے آخری کتاب یعنی قرآن کریم نے کیا ہے، اُس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ چند باتوں کے ماننے اور اُن پر دل سے اعتقاد رکھنے کا مطالبہ ہر آسمانی کتاب اور ہر پیغمبر کی تعلیمات میں کیا گیا ہے، مثلاً توحید، رسالت، کتب الٰہیہ، فرشتے، یوم آخرت، اور یہ بات دل کو لگتی بھی ہے کہ جب قانون بنانے والا ایک ہی ہے، اور جس کے لئے قانون بنایا گیا اس کے تمام افراد ایک ہی فطرت رکھتے ہیں تو پھر بنی نوع انسان کے لئے

فدیہ ادا کرتا۔ اس کی رہائی کا یہ فدیہ مقرر کیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک اہل مدینہ کے لڑکوں میں سے دس دس لڑکوں کو لکھنا سکھائے، چنانچہ زید بن ثابتؓ نے بھی اسی طور سے لکھنا سیکھا۔[1]

قرآن کریم نے عربوں کو اپنی ایک خاص اصطلاح کے اعتبار سے جاہل کہا ہے نہ کہ مشہور معنی کے اعتبار سے، اور مشہور معنی کے لحاظ سے بھی ان کو جاہل کہنا غلط اس لئے نہ ہوگا کہ ان میں زیادہ تر لوگ پڑھے لکھے نہ تھے۔ قرآن عربوں کی اخلاقی اور اعتقادی زندگی کو جو اسلامی تعلیمات کے خلاف اور غیر معقول حد تک تقلید پسندی کی طرف مائل تھی جاہلیت سے تعبیر کرتا ہے، جو شخص قرآن کریم کی اصطلاح سے ناواقف ہو اور زمانۂ جاہلیت کی تاریخ پر نظر نہ رکھتا ہو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام سے پہلے عرب کے لوگ چونکہ بالکل لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے، اس لئے اُن کے زمانے کو قرآن میں جاہلیت کا زمانہ کہا ہے۔

یہ بات تو عقل میں آتی ہے کہ عربوں کے پاس ایسا کاغذ جیسا کہ ہمارے زمانے میں ہے، موجود نہ تھا، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہی نہ تھی کہ جس پر وہ لکھ سکتے، سورۃ البقرۃ کی پہلی آیت میں ہے، ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک نہیں) شروع قرآن میں لفظ کتاب کا استعمال جس کے معنی لکھی ہوئی چیز کے ہیں، یہ بتا رہا ہے کہ پیش کرنے والا ابتدا ہی سے اس کو لکھی ہوئی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے، اور پھر کفارِ مکہ کا یہ کہنا۔

---

[1] تاریخ القرآن صفحہ ۴-۵ (تالیف مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی)

ہیں، اس بے دینی اور الحاد کے زمانے میں اُن میں قُرّاء اور حفاظِ قرآن کی ایک ایسی بڑی جماعت موجود ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک موجود رہے گی کہ جس کے ہوتے ہوئے اس کتاب کی حفاظت خطرے میں نہیں پڑ سکتی۔ اس کو جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ کرامؓ نے پڑھا آج بھی وہ اسی طرح پڑھا جا رہا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عرب تو جاہل تھے اور قرآن میں بھی اُن کو جاہل کہا گیا ہے، اُن میں ایسے پڑھے لکھے لوگ کہاں سے آگئے جو قرآن کی آیتوں کو لکھ لیتے تھے؟ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب کے لوگ بالکل جاہل تھے، اُن کو چاہیئے تھا کہ اس دعوے کو دلائل سے ثابت کرتے، تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ عرب میں ایک خاصی تعداد پڑھے لکھے لوگوں کی موجود تھی۔ مولانا عبد اللطیف صاحب رحمانی نے اپنی کتاب "تاریخ القرآن" میں تاریخ کے حوالے سے اکتالیس ایسے صحابہ کے کہ جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے نام گنانے کے بعد لکھا ہے۔

" ان میں انصار اور مہاجرین دونوں ہیں، اور بعض ایسے بھی ہیں جو اسلام لانے سے پہلے لکھنا پڑھنا جانتے تھے، مؤرّخین اس میں مختلف ہیں کہ عرب میں کتابت اور خطاطی کا فن کس سے شروع ہوا؟ بعض کی رائے میں حضرت ایوّب علیہ السلام کے وقت میں عرب میں یہ فن تھا، بعض کہتے ہیں کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے عہد سے شروع ہوا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ اسلام کے کچھ قبل عرب میں اس کا رواج ہو گیا تھا، اور جناب سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد میں اس کو بہت ترقی دی۔ بدر کی جنگ میں جو ستّر آدمی کفّارِ مکّہ کے مسلمانوں نے گرفتار کیے تھے، ان میں جس کے پاس اس قدر مال نہ تھا کہ اپنی رہائی کے لئے

"تاریخ القرآن" میں مفتی عبداللطیف صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"اصل یہ ہے کہ اس زمانے میں چمڑے یا کپڑے پر روغن دے کر بجائے کاغذ کے استعمال کرتے تھے، جیساکہ علامہ ابن خلدون مغربی نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں لکھا ہے[1]۔"

اس کے علاوہ قرآن کریم میں رَقٌّ[2]، قِرْطَاسٌ[3]، صُحُفٌ، صَحِيفَةٌ، قَلَمٌ، اَلْوَاحٌ[4]، مِدَادٌ (روشنائی) وغیرہ کے الفاظ جن کا تعلق لکھنے پڑھنے سے ہے، استعمال کئے گئے ہیں، اگر ان الفاظ کا کوئی مفہوم عربوں کے ذہن میں پہلے سے موجود نہ تھا تو کیا کسی شخص کو ایسے الفاظ سے خطاب کرنا کہ جن کو وہ بالکل نہ سمجھتا ہو اصولِ بلاغت کے خلاف نہیں ہے، اور وہ عرب کہ فصاحت و بلاغت جن کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، کیا یہ اعتراض نہ کرتے کہ جس کتاب میں اتنی بڑی اصولی غلطی کی گئی ہو وہ کتاب خدا کی طرف سے کیسے ہوسکتی ہے؟

حفاظتِ قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام

قرآن کریم کی جو آیتیں نازل ہوتی جاتی تھیں آپ ان کو لکھواتے جاتے تھے، وحی کے لکھنے کے لئے آپ نے چند صحابہؓ کو مقرر اور مخصوص کر دیا تھا، اور

---

[1] تاریخ القرآن صفحہ ۵۸ [2] اَلرَّقُّ۔ وہ چمڑا جو لکھنے کے لئے باریک تراش لیا جائے [3] القرطاس وہ صحیفہ کہ جس پر لکھا جائے چمڑے کا ہو یا کسی اور چیز کا۔ [4] اَلْوَاح۔ لوح کی جمع ہے، تختی کو کہا جاتا ہے، لکڑی کی ہو یا ہڈی کی یا کسی اور چیز کی، جیسے پتھر وغیرہ کی سلیٹ بنا لیتے ہیں۔

وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ٥ (الفرقان)	اور وہ (کفار مکہ) کہنے لگے کہ یہ تو بے سند باتیں ہیں جو اگلوں سے منقول ہوتی چلی آئی ہیں، جن کو اس شخص نے لکھوا لیا ہے، پھر وہی اس کو صبح و شام پڑھ پڑھ کر سنائی جاتی ہیں۔

بتلا رہا ہے کہ عرب میں لکھنے والے اور لکھنے کی چیزیں موجود تھیں، تب ہی تو انھوں نے پیغمبر اسلام پر یہ الزام لگایا کہ یہ کتاب جس کے متعلق تم یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ خدا کی طرف سے ہے درحقیقت خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ تم نے خود لکھ لی ہے یا لکھوالی ہے۔ اگر اس زمانے میں کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی کہ جس پر لکھا جا سکتا تو عرب لوگ ایسی بات ہرگز نہ کہتے جس کے متعلق ان کو یقین ہوتا کہ آپ فوراً اس کی تردید میں یہ کہہ دیں گے کہ تمھارا یہ الزام ہی غلط ہے کہ میں نے یہ کتاب لکھ لی یا لکھوالی ہے، کیونکہ نہ کوئی لکھنے والا ہی موجود ہے، اور نہ کوئی ایسی چیز کہ جس پر لکھا جاسکے، تو میں کیسے لکھوا لیتا۔

عرب میں یقیناً لکھنے پڑھنے کا رواج تھا، آپس کے معاہدے اور خطوط وغیرہ کو وہ کسی نہ کسی چیز پر لکھتے ہی ہوں گے۔ عقل اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جن عربوں کی تجارت ایران اور ہندوستان کی بندرگاہوں تک پھیلی ہوئی تھی، وہ تمام تجارتی کاروبار زبانی ہی کرتے ہوں گے، اور ان کو کسی چیز کے لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہ پڑتی ہوگی، "تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ "حدیبیہ" میں صلح نامہ لکھا گیا، اہل مکہ نے ایک معاہدہ لکھ کر بیت اللہ میں لٹکایا، سبعہ معلقہ لکھوا کر خانہ کعبہ پر لٹکایا گیا، توریت و انجیل لکھی ہوئی ان میں موجود تھی"[1]

---

[1] تاریخ القرآن صفحہ ۷

نے وحی الہی کی روشنی میں فرمائی تھی، اسی ترتیب کے مطابق آپ نے قرآن مجید لکھوایا، اور موجودہ قرآن کریم اسی ترتیب کے مطابق ہے۔ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوا ہے۔ بہت سے صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانے میں پورا قرآن حفظ کر کے دوسروں کو حفظ کرایا، اور آج تک آیتوں اور سورتوں کی وہی ترتیب محفوظ ہے۔

علّامہ جلال الدین سیوطی نے بہت سے علماء کے اقوال اس کی تائید میں نقل کئے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضرت عثمانؓ کی روایت جس کو امام ترمذیؒ نے بیان کیا ہے، ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

فَكَانَ اِذَا نَزَلَ عَلَيْهِ الشَّئُ دَعَا بَعْضَ مَنْ كَانَ يَكْتُبُ فَيَقُولُ ضَعُوْا هٰذَا فِى السُّوْرَةِ الَّتِى يُذْكَرُ فِيْهَا كَذَا وَكَذَا	جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی چیز نازل ہوتی تو آپ لکھنے والوں میں سے کسی کو بلاتے اور فرماتے کہ اس کو فلاں سورۃ میں لکھو جس میں کہ ان ان باتوں کا ذکر ہے۔

علّامہ ابن حزم نے کتاب الفصّل میں کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے قرآن کی آیات اور سورتوں کو خدا کے حکم سے ترتیب دیا ہے۔

"تاریخ القرآن" میں مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی قرآنی آیات اور سورتوں کی ترتیب کے متعلق بہت سی مستند احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"الغرض بانیِ اسلام نے سورتوں کی آیات میں اور سورتوں میں جو ترتیب قائم کی، اور ہزاروں صحابہ نے آپ سے جس ترتیب سے سنا اور آپ نے پڑھایا لکھایا، اسی ترتیب سے صحابہ نے یاد کیا اور لکھا اور ان کے بعد تابعین نے بھی

ان ہی لوگوں کے ہاتھوں پورا قرآن آپ کے زمانے میں لکھا گیا۔

صحیح بخاری میں ہے۔

عَنْ قَتَادَةَ سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ مَنْ جَمَعَ الْقُرْآنَ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اَرْبَعَةٌ كُلُّهُمْ مِنَ الْاَنْصَارِ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ وَمَعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَزَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَاَبُوْ زَيْدٍ	حضرت قتادہؓ کہتے ہیں میں نے انس بن مالک سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن کس نے جمع کیا، انھوں نے کہا چار آدمیوں نے اور وہ چاروں انصاری تھے - ابی بن کعب - معاذ بن جبل، زید بن ثابت اور ابوزید"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی صحابہ کرامؓ کو قرآن کریم کی تعلیم دیتے اور ان میں سے کچھ لوگ اس کو زبانی یاد کرنے کے بعد لکھ بھی لیا کرتے تھے، تعلیم کا یہ سلسلہ مکے ہی سے شروع ہوگیا تھا، اور مدینے آنے کے بعد باقاعدہ اس کی درس گاہ قائم ہوگئی، جہاں صحابہ کرام پہلے خود سیکھتے اور پھر دوسروں کو پڑھاتے، آپ نے بہت سے صحابہ کرام کو قرآن کی تعلیم کے لئے باہر بھیجا۔

زید بن ثابتؓ جن کا ذکر اوپر لکھی ہوئی روایت میں آچکا ہے، کہتے ہیں "قرآن کی جو آیات نازل ہوتیں آپ مجھے لکھا دیتے، اُن کے لکھنے کے بعد پھر میں آپ کو سناتا، اگر اصلاح کی ضرورت ہوتی تو آپ اصلاح کر دیتے، اس کے بعد میں وہ آیات دوسرے لوگوں کو لکھوا دیتا تھا"۔

عہد رسالت میں قرآن کا جمع کیا جانا اور اسکی ترتیب

قرآن کریم کی آیات اور سورتوں کی ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پورا قرآن لکھ لیا تھا۔ یہاں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ جب بہت سے صحابہؓ نے آپ کے سامنے پورا قرآن کریم لکھ لیا تھا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں کیا کام انجام پایا؟ اور حضرت عمر فاروقؓ نے اس سلسلے میں آپ سے کس خدمت کا مطالبہ کیا، کہ جس میں آپ نے پہلے تو پس وپیش کیا، اس کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے قرآن کی جمع و ترتیب کی خدمت چند صحابہ سے بڑے اہتمام سے انجام دلائی؟ ظاہر بات ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کا مطالبہ یہ نہ تھا کہ قرآن کریم لکھا جائے، لکھا تو پہلے ہی جا رہا تھا، دو چار نہیں بلکہ بہت سے لوگ لکھ رہے تھے، اور لکھ چکے تھے، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انفرادی طور پر کسی صحابی نے پورا قرآن کریم لکھنے کے بعد اس کو حفاظت اور پڑھنے میں آسانی کے خیال سے کتابی شکل میں مجلّد بھی کرالیا ہو، لیکن حضرت عمر فاروقؓ کا مطالبہ یہ تھا کہ آپ حکومت کی طرف سے تمام قرآنی سورتوں کو ایک ہی تقطیع کے اوراق پر لکھوا کر ایک جلد میں مجلّد کرا دیجئے، چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کام اپنے سامنے نہیں کرایا تھا، اس لئے ابوبکر صدیقؓ ذرا جھجکے، لیکن بعد میں خود آپ کا فیصلہ بھی یہی ہوا کہ بجائے متفرّق رسالوں کی صورت میں رہنے کے اُن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ترتیب کے مطابق مرتّب کر کے کتابی شکل میں ایک جگہ کر دیا جائے مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے "ایک سائز کے اوراق پر لکھے ہونے کی وجہ سے ابوبکر صدیقؓ کی حکومت کے مرتب کردہ اُس نسخے کو "رَبْعَہ" بھی کہتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اوراق کا طول وعرض برابر تھا، اور ربعہ کا ترجمہ

صحابہؓ سے جو ترتیب سنی یا لکھی وہ وہی ترتیب تھی جو بانیٔ اسلام کے مبارک عہد میں قائم ہو چکی تھی اور نسلاً بعد نسلٍ اسی طرح سے اس وقت تک محفوظ ہے۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی میں اکثر ملکِ عرب کی سر زمین آفتابِ اسلام سے منوّر ہو چکی تھی، مغرب میں بحرِ احمر سے یمن تک کے کنارے کنارے خلیج فارس تک پہنچ گیا تھا۔ بحرین، نجد، عمّان، یمن، طائف، مکّہ، مدینہ ان تمام بڑے بڑے شہروں اور ان کے اطراف دیہاتوں اور تمام قبائل میں اُسی وحدہٗ لاشریک کی پانچوں وقت بآوازِ بلند منادی کی جاتی تھی۔ حجۃ الوداع میں ایک لاکھ چھبیس ہزار مسلمانوں کو آنحضرتؐ کی ہمرکابی کا فخر حاصل تھا، اور ان کے سوا لاکھوں کی تعداد میں تمام عرب میں مسلمان پھیلے ہوئے تھے، ہر مسلمان پر پانچ وقت کی نمازیں پڑھنا لازمی تھا، جن میں ایسے مسلمان بھی کثرت سے تھے، جو رات کے آخر حصّے میں جاگتے، اور قرآن پڑھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے ہزاروں مسلمانوں نے نمازمیں قرآن بارہا سنا، بلکہ اس کثرت سے سنا گیا کہ بعض کو سنتے سنتے پوری پوری سورتیں یاد ہو گئی تھیں، ہر رمضان میں پورے قرآن کا آپ دَور کرتے جس میں صحابہ بھی شریک ہوتے، ہزاروں صحابہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود بھی قرآن پڑھایا۔"[1]

حفاظتِ قرآن میں صحابہ کرامؓ کا اہتمام

طبقات ابن سعد میں ایسے کئی صحابہ کرام کے نام گنائے گئے ہیں جنھوں نے

---

[1] تاریخ القرآن صفحہ ۹۸-۹۹

اسلام ترقی کر رہا تھا، اور مختلف ممالک کے لوگ برابر مسلمان ہوتے جا رہے تھے، جن میں عجمی لوگوں کی تعداد کافی تھی، یہ لوگ عربی الفاظ کا تلفظ اچھی طرح سے نہ کر سکتے تھے، خود عرب کے قبائل میں بھی لب و لہجے کا اختلاف موجود تھا، جیسا کہ تمام زبانوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم میں تحریف کا کوئی امکان نہ تھا لیکن لہجوں کے اختلاف کا کسی نہ کسی نوعیت سے الفاظ قرآن پر اثر پڑ سکتا تھا، اس لئے حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اُس نسخہ کی نقل کرانے کے لئے جو عہد صدیقی میں تیار ہوا تھا، حضرت حفصہؓ سے منگوا کر زید بن ثابتؓ کی نگرانی میں چند لوگوں کو مقرر کیا، ان لوگوں نے چند نقلیں تیار کیں، حضرت عثمانؓ نے ایک ایک نسخہ مختلف صوبوں کے پایۂ تخت اور چھاؤنیوں میں بھیج کر فرمان جاری کر دیا کہ آئندہ سے لوگ اس نسخے کی نقل کرا کر تلاوت کیا کریں، اور قرآن کے جو نسخے اُن کے پاس ہوں اُن کو حکومت کے حوالے کر دیں۔ حضرت عثمان غنیؓ کا قیامت تک آنے والے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہے کہ کتابت کی حد تک اُنھوں نے قرآن میں وحدت کا رنگ پیدا کر دیا، تلفظ اور لب و لہجے میں پورے طور پر یکسانیت پیدا کر دینا ان کے بس میں نہ تھا۔

قرآن مجید کی حفاظت کے ساتھ عربی زبان کی حفاظت بھی ہو جاتی ہے، صدیاں گزرنے کے بعد آج بھی ممالک مشرق و مغرب، شمال و جنوب کے عربی بولنے والوں کی تحریری زبان ایک ہی ہے، جو قرآن مجید کی زبان کے تابع ہے، اور تمام دنیا کے مسلمانوں کو بشرطیکہ وہ اس راز کو سمجھیں ایک مضبوط لڑی میں پرو دیتی ہے[1]

---

[1] ملخص از "تاریخ اسلام پر ایک نظر" صفحہ ۳۰۴ (تالیف مولوی محمد عبد الرحمٰن خاں صاحب ایم اے صدر حیدرآباد دکن)

ہے "چوکھونٹا"۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ ابوبکر صدیقؓ کے زمانۂ خلافت میں جو نسخہ مرتّب ہوا تھا اس کو "ربعہ" کہا جاتا تھا۔[1]

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں قرآن مجید کی حفاظت اور اشاعت کا بہت اہتمام کیا، تمام مفتوحہ ممالک میں قرآن مجید کی تعلیم کا انتظام کیا، اور معلّموں اور قاریوں کی حکومت کی طرف سے معقول تنخواہیں مقرر کردیں، آپ نے خانہ بدوش بدوؤں کے لئے قرآن کی تعلیم کو لازمی قرار دیا، اور ایک شخص کو جس کا نام ابوسفیان تھا چند آدمیوں کے ساتھ مقرر کیا کہ قبائل میں پھر کر ایک ایک شخص کا امتحان لے اور جس کو قرآن مجید کی کوئی آیت یاد نہ ہو اس کو تنبیہہ کرے۔[2]

"حضرت عمرؓ نے اشاعتِ قرآن کے لئے اور بہت سی تدبیریں اختیار کیں، عمال کو لکھ بھیجا کہ جو لوگ قرآن سیکھیں اُن کی تنخواہیں مقرر کردی جائیں، ناظرہ خوانوں کا تو شمار نہ تھا، حفّاظ کی تعداد بھی ہزاروں سے متجاوز ہوگئی"۔[3]

"صحابہ میں حفّاظ قرآن کی تعداد پر اس سے کافی روشنی پڑتی ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے سردارانِ لشکر کو لکھا کہ ہر شخص اپنے اپنے یہاں کے حفّاظ قرآن کی فہرست مرتب کرکے بھیجے تاکہ میں اُن کے رتبے کے موافق بیت المال سے اُن کا وظیفہ مقرر کروں اور بلادِ اسلامیہ میں اُنھیں تعلیم قرآن کے لئے بھیجوں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے تنہا اپنے یہاں سے تین سو سے کچھ اوپر کی فہرست دی"۔[4]

---

[1] تدوین قرآن صفحہ ۶۴ (تالیف مولوی غلام ربانی صاحب ایم اے (عثمانیہ) [2] ملاحظہ ہو تفصیل کے لئے الفاروق صفحہ ۵۹ [3] مقالات شبلی صفحہ ۱۲ [4] تاریخ القرآن صفحہ ۵۴ - ۶۴

دنیا کی طاغوتی طاقتیں اپنے تمام علوم و فنون کا زور ختم کر دیں، تب بھی ایسی پوری کتاب تو کیا اس کتاب کی ایک چھوٹی سے چھوٹی سورۃ بھی نہیں بنا سکتیں۔ اپنے عجز کا اقرار فن بلاغت کے ماہر عربوں نے پہلے بھی کیا اور اس وقت سے آج تک بہت سے مخالفین برابر کرتے آئے ہیں۔

قرآن کریم کے مشہور مترجم جارج سیل قرآن کے متعلق ذیل کے الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں۔

"قرآن جیسی معجز کتاب انسانی قلم نہیں لکھ سکتا، یہ مستقل معجزہ ہے جو مُردوں کے زندہ کرنے کے معجزے سے بلند تر ہے"[1]

یہاں تو مختصر طور پر یہ بتانا ہے کہ قرآن کے ماننے والے جب تک اس سے اجنبی نہ ہوئے تھے اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے تھے، اس وقت تک اس کتاب نے ان کو دنیا کی قوموں کا سرتاج بنائے رکھا، قیصرو کسریٰ کے خزانوں کی کنجیاں اُن کے ہاتھوں میں دے دیں۔ اور انسانوں نے اپنے لئے یہ باعثِ فخر سمجھا کہ قرآن کے ماننے والے اور اس پر عمل کرنے والے ان کے اوپر حکومت کریں، ان تمام باتوں کی گواہی صرف مسلمانوں کی کتابوں سے نہیں بلکہ غیر مسلموں کی لکھی ہوئی تاریخوں سے اب بھی مل سکتی ہے، لیکن جب سے مسلمانوں نے قرآن پر عمل کرنا چھوڑ دیا وہ پستی کی طرف آتے گئے، اور دنیا کی نگاہوں میں اُن کا وہ وقار بھی باقی نہ رہا، آج بھی وہی قرآن موجود ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے اس کے ماننے والے اس پر عمل کر کے اپنی زندگی کا ثبوت نہیں دیتے۔

---

[1] تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام صفحہ ۸۰ (تالیف مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند)

یہاں قرآن کریم کے اس اثر کا بیان کرنا مقصود نہیں ہے، جو اُس نے فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ان عربوں کے دلوں پر چھوڑا جن کی فصاحت و بلاغت کا سکّہ دور دور بیٹھا ہوا تھا، اور نہ یہ بتانا ہے کہ مشرکین مکّہ کے سرغنہ ولید بن مغیرہ نے کفارِ مکّہ کے سامنے کن الفاظ میں اس کتاب کی فصاحت و بلاغت کا اعتراف کیا، اور نہ ہی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ عمر بن الخطاب، جُبیر بن مطعم، لبید بن ربیعہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو قرآن کی فصاحت کے سوا کوئی بڑی سے بڑی دلیل بھی اسلام کی طرف لانے میں کامیاب نہ ہوئی۔ ضرورت تھی کہ اعجاز القرآن کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا جاتا، کیونکہ اس زمانے میں بھی قرآن مجید کے بارے میں ویسی ہی باتیں کہنے والے موجود ہیں جیسی کہ نزولِ قرآن کے وقت اسلام کی مخالفت کرنے والے لوگوں نے کہی تھیں کہ قرآن خدا کا کلام نہیں ہے، لیکن یہ ایک مستقل موضوع ہے جس کے لئے علاحدہ تالیف درکار ہے۔ زیادہ لطف کی بات یہ ہے کہ ان منکرین میں اکثر وہ لوگ ہیں کہ جو نہ عربی زبان سے واقفیت رکھتے ہیں اور نہ اُنھوں نے قرآن کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ان کے زیادہ تر اعتراضات اور شبہات سنی سنائی باتوں پر مبنی ہیں۔ سیّد رشید رضا مصری نے لکھا ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہو رہا تھا عربوں کی فصاحت و بلاغت شباب پر تھی۔ اس سے پہلے عرب میں کبھی اتنے ذکی اور ذہین ماہرینِ بلاغت جمع نہ ہوئے تھے[1]۔ قرآن کریم مخالف لوگوں کو آج بھی چیلنج دیتا ہے، اور اسی جواب کو دُہراتا ہے کہ جو اُس نے مشرکینِ عرب کو دیا تھا، وہ یہ کہ اگر ساری

---

[1] رسالۃ التوحید صفحہ ۱۴۵

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن (اقبالؒ)

قرآن اور سماج کی اصلاح

شروع سے آخر تک اس کتاب کو پڑھ جایئے بخوبی اندازہ ہو جائے گا، کہ اس میں سب سے زیادہ زور سماجی زندگی کو بہتر بناتے پر دیا گیا ہے، افراد کی اصلاح کے بغیر سماج کی اصلاح ناممکن ہے، جب معاشرہ یا سماج بہتر ہو جاتا ہے تو لوگوں کو سکون وچین سے مفید اور اچھے کاموں میں مشغول ہونے کا موقع ملتا ہے، اور لوگ ترقی کے لئے سوچتے ہیں، اس کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ اسلامی عبادات کی بڑی غرض اصلاح اخلاق کے ذریعے سماج کو بہتر بنانا ہے، پیغمبر بھی اسی لئے آئے کہ وہ انسانوں کو امن وشانتی کی زندگی گزارنا سکھائیں۔ قرآن کریم نے سماجی زندگی کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا اور ہر ہر پہلو پر روشنی ڈال دی ہے۔

دوسرے مذاہب کی کتابوں میں بھی سماج کی اصلاح سے تعلق رکھنے والی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، لیکن ان میں قرآن جیسی جامعیت نہیں پائی جاتی۔ یہ قرآنی تعلیمات ہی کا اثر تھا کہ مسلمانوں نے جن ممالک کو فتح کیا، ان میں سماجی اور معاشرتی اصلاحات پر کافی توجہ صرف کی، یہاں تک کہ ان ملکوں کے باشندوں کو نمایاں طور پر محسوس ہونے لگتا تھا کہ اس انقلاب سے اُن کو نقصان نہیں بلکہ فائدہ پہنچا ہے۔

اسپین کی فتح کا حال بیان کرتے ہوئے مشہور مورّخ ڈوزی (Dozy) لکھتے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر (اقبالؒ)

میرا مطلب دنیا کی مسلم اکثریت سے ہے، ورنہ اب بھی دنیا کے ہر گوشے میں اچھی خاصی تعداد اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والوں اور قرآن کی بخشی ہوئی روشنی پر چلنے والوں کی موجود ہے۔

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (اقبالؒ)

قرآن کریم اور اسلامی تعلیمات کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے ڈاکٹر لیبون لکھتے ہیں۔

"کسی مذہبی کتاب کے فوائد عامہ کا اندازہ کرتے وقت یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ اس میں فلسفی خیالات کیسے ہیں (کیونکہ یہ عموماً بہت ہی کمزور ہوا کرتے ہیں) بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ جن اعتقاداتِ دینی کی تعلیم اس کتاب میں دی گئی ہے، انھوں نے دنیا میں کیا اثر پیدا کیا، اور جس وقت اسلام کو اس نظر سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دنیا کے اُن مذاہب میں جنھوں نے قلوب پر حکومت کی ہے یہ بھی ایک نہایت عالی شان مذہب ہے، اسلام میں بھی نیکی، انصاف، عبادت وغیرہ کی ویسی ہی تعلیم ہے جیسے کُل اور ادیان میں، لیکن یہ تعلیم ایسی سادگی اور وضاحت کے ساتھ دی گئی ہے کہ ہر شخص کی سمجھ میں آتی ہے، اسلام قلوب میں اس قسم کا زندہ اور پُر زور جوشِ ایمان پیدا کرتا ہے کہ پھر اس میں مطلقاً شک اور تذبذب کی گنجائش نہیں رہتی۔"[1]

---

[1] تمدّنِ عرب صفحہ ۱۲۱ (ترجمہ علامہ سیّد علی بلگرامی)

"عربوں کا طریقہ تحقیق تجربہ و مشاہدہ تھا، برخلاف اس کے زمانۂ متوسط کے یورپ کا طریقہ اساتذہ کے کلام کو پڑھنا اور ان ہی رایوں کو بار بار بیان کرنا تھا، ان دونوں میں بہت ہی اصولی فرق ہے، اور بلا اس فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم عربوں کی علمی تحقیقات کی پوری قدر نہیں کرسکتے۔ پس عربوں ہی نے علمی تحقیقات میں تجربے کو داخل کیا اور ایک زمانۂ دراز تک صرف عرب ہی تھے جو اس طریقے کی قدر جانتے تھے، تجربی طریقے نے ان کی تحقیقات میں ایک صحت اور جدت پیدا کردی تھی جو ان اشخاص کی تحقیقات میں نہیں پائی جاتی، جو حوادث کو کتابوں ہی میں دیکھتے ہیں، تجربہ اور مشاہدہ کو اقوال اساتذہ کے مقابل میں تحقیقات علمی کے اصول قرار دینا عموماً بیکن[1] کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن اس وقت تسلیم کرلینا چاہیئے کہ اس کے موجد عرب تھے"[2]

قرآنی تعلیمات کا معاشی پہلو

سماجی زندگی کی کامیابی کا دارومدار جس طرح اخلاقی قدروں کے تسلیم کرنے اور روحانی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے، اسی طرح کسی سماج کو اُس وقت

---

[1] فرانسس بیکن ایک بہت مشہور انگریزی امیر اور مصنف ہے، اس کی تصانیف کثرت سے ہیں، اور یہ اس جدید فلسفے کا جس میں مشاہدات اور استقرار سے کام لیا جاتا ہے، موجد سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ مصنف اور فلسفی ہونے کے اس نے دولت میں بہت بڑی بڑی خدمتیں بھی حاصل کیں، اور بالآخر لارڈ چانسلر کے عہدے پر جو عدالتی خدمات میں سب سے اعلیٰ درجہ ہے مقرر ہوا۔ سال پیدائش ۱۵۶۱ء سال وفات ۱۶۲۶ء (حاشیہ تمدنِ عرب صفحہ ۴۰۰) [2] تمدنِ عرب صفحہ ۴۰۰-۴۰۱

"بعض اعتبارات سے عربوں کی فتح اسپین کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی کیونکہ وہ اپنے ساتھ نہایت اہم سماجی انقلاب لائی، اور اس نے ان تمام خرابیوں کا جو صدیوں سے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں قلع قمع کر دیا، اہل کلیسا اور امراء کے اثر واقتدار کو ختم کر دیا، بڑے بڑے جاگیرداروں سے زمینیں لے کر بہت سے لوگوں میں تقسیم کر دی گئیں، اور صحیح معنی میں کاشتکاروں کو مالکانہ حقوق دلائے گئے۔ اس سے بہت فائدہ ہوا، اسلامی اسپین میں زراعت اور کھیتی باڑی کے پھولنے پھلنے اور اس کی ترقی کے اسباب میں سے یہ ایک بڑا سبب ہے، اس فتح سے لوگوں کے مختلف طبقات کی حالت سدھر گئی، غلامی سے آزادی دلانے میں اسلام عیسائیت کے مقابلے میں زیادہ پیش پیش تھا۔"[1]

اندلس کی فتح کے بعد عربوں نے اس کو مختلف علوم وفنون کا مرکز بنا دیا، اور طریقہ تحقیق میں تجربہ ومشاہدہ کی راہ عربوں ہی نے نکالی ——— ڈاکٹر لیبون "تمدنِ عرب" میں رقم طراز ہیں۔

"صرف عربوں کے اندلس میں دسویں صدی میں ہونے کی بدولت یورپ کے ایک گوشے میں علوم وادب کا وہ چرچا باقی رہا، جو ہر جگہ یہاں تک کہ قسطنطنیہ میں بھی متروک ہو گیا تھا، اس زمانے میں بجز عربی سرزمین اندلس کے اور کوئی مقام نہ تھا جہاں علوم کا تحصیل کرنا ممکن ہو، اور یہیں وہ خاص اور معدود اشخاص جن کو علم کا شوق تھا تحصیل کے لئے آتے تھے۔"[2]

اسی کتاب میں ڈاکٹر لیبون لکھتے ہیں۔

---

[1] اسپینش اسلام صفحہ ۲۳۸ (Spanish Islam P.238) [2] تمدن عرب صفحہ ۵۱۵

لوگوں کو قرآن کریم کی آیت وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ٥ (اور ہم نے آپ پر قرآن اُتارا ہے، جو تمام باتوں کا بیان کرنے والا ہے، اور مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور خوش خبری سُنانے والا ہے) سے شبہ ہو جاتا ہے کہ قرآن سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں ہر چیز کا بیان ہے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں بہت سی باتوں اور چیزوں کا ذکر نہیں ہے۔ اس شبہ کی وجہ یہ ہے کہ ہم کو قرآن کا اصل موضوع معلوم نہیں، مذکورہ بالا آیت میں "شیٔ" سے مراد انسانی اقوال و افعال ہیں، جن کا تعلق انسان کی ہدایت سے ہے، اسی لئے ان کے علاوہ اور دوسری چیزوں کا ذکر قرآن میں ضمناً اور اشارۃً کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی ابتداء میں کہا گیا ہے کہ یہ کتاب ہدایت کرنے والی ہے، لیکن اس آیت میں قرآن کو ہدایت کے علاوہ رحمت اور خوش خبری بھی بتایا گیا، اس کی وجہ اُس وقت آسانی سے سمجھ میں آجائے گی، جبکہ سورۃ النحل کو جس کی یہ آیت ہے غور سے پڑھا جائے، اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ان بہت سی نعمتوں کو بیان کیا ہے جو اس نے انسان کو عطا کی ہیں، اس سے بڑی رحمت اور خوش خبری انسان کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے دنیوی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔

اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" میں مولانا سیّد مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے۔

"اور سچ تو یہ ہے کہ جب شاہی ساز و سامان کو بھی قرآن انسانیت کے ارتقا کی آخری منزل یعنی "نبوت" کے منافی نہیں خیال کرتا، باوجود پیغمبر اور خدا سے برگزیدہ ہونے کے حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق مختلف مقامات میں شیش محل، عرش،

ملک کامیاب نہیں کہا جا سکتا جب تک معاشی اعتبار سے بھی وہ خوش حال نہ ہو، حد سے زیادہ غربت وافلاس کی زندگی میں اخلاقی قدروں کی حفاظت ہر انسان کا کام نہیں ہے۔

یہ کہنا صحیح ہے کہ قرآن کوئی تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، مختلف علوم سائنس اور صنعت وحرفت سکھانے والی کتاب نہیں ہے، اسی لئے اس میں ان علوم کی تفصیل نہیں کی گئی، لیکن جبکہ یہ معلوم ہے کہ سماج کی ترقی یا اچھے سماج کا پایا جانا صرف روحانیات اور اخلاقیات تک محدود نہیں ہے تو قرآن یقیناً ایک ناقص اور نامکمل کتاب رہ جاتی، اگر اس میں روحانی تعلیمات کے ساتھ ساتھ انسان کو مادیات کی طرف متوجہ نہ کیا جاتا، یہی وجہ ہے قرآن کریم نے بار بار انسان کو ان باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے کہ جن کا تعلق انسان کی معاشی زندگی سے ہے اور یہ ظاہر ہے کہ معاشی زندگی کے پھولنے اور پھلنے کا بہت کچھ مدار مختلف علوم وفنون کی ترقی پر ہے، بہت سے علوم وفنون کی طرف قرآن کریم نے اشارہ کر دیا ہے، تاکہ انسان دنیوی زندگی کو بہتر بنانے میں ان سے ... دو لے، ان کی ترقی میں کوشاں رہے، اور بے انتہا عجائبات قدرت دیکھ کر خالق کائنات کے سامنے سربسجود ہو جائے۔ قرآن ایسی زندگی کو پسند نہیں کرتا جس میں انسان گوشہ نشین ہو کر دنیا کو بالکل چھوڑ دے، کیونکہ بسا اوقات ایسی زندگی سماج میں بہت سی خرابیاں پیدا کر دیتی ہے، اس کے نزدیک وہ روحانیت کہ جو معاشی ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے اور انسان کو بالکل دنیا کے کام کا ہی نہ چھوڑے، کوئی قدر وقیمت نہیں رکھتی، ایسی روحانیت کو قرآن "رہبانیت" سے تعبیر کرتے ہوئے اس کو سماج کے جسم میں گھن بتاتا ہے کہ جو اس کو بہت جلد کھوکھلا کر دیتا ہے۔

کے نام بھی گنائے ہیں کہ جنھوں نے مختلف علوم وفنون کی ترقی میں بے دریغ دولت خرچ کی، مورخ مذکور نے مسلمانوں کے بعض علوم کی طرف خاص توجہ کی وجہ بھی لکھی ہے، مثلاً علم جغرافیہ کے متعلق لکھا ہے۔

" اہلِ اسلام میں حج کا رواج، مسجدوں کے بناتے وقت اور نماز میں قبلہ کی سمت کا التزام واہتمام، یہ وہ باتیں ہیں کہ جنھوں نے مسلمانوں کو اس علم کے سیکھنے کی طرف متوجہ کیا[1]"

محمد مارماڈیوک پکتھال (Muhammad Marmaduke Picthall) نے ایک مرتبہ مدراس میں اسلامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ لیکچر دیئے جو کتابی شکل میں" دی کلچرل سائڈ آف اسلام " (The Cultural Side of Islam) کے نام سے چھپ چکے ہیں، انھوں نے چوتھے لیکچر میں جو کہ ۲۲ صفحات میں پھیلا ہوا ہے، ان علوم و فنون کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جن کے موجد اور ترقی دینے والے مسلمان ہیں، اس لیکچر کے شروع میں پکتھال نے قرآن کریم کو تمام علوم کا سرچشمہ اور منبع قرار دیتے ہوئے ان لوگوں سے جو ان کے لیکچر میں موجود تھے جو کچھ کہا اس کا حاصل یہ ہے۔

" اگر آپ مجھے اجازت دیں تو اسلامی تہذیب کے اس مختصر سے خاکے میں اس کی سب سے زیادہ نمایاں چیز، قرآن کریم پر تفصیلی روشنی نہ ڈالوں، اسلام کی ثقافتی اور تمدنی ترقیوں کے اسباب پر غور کرتے وقت سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلینا چاہیئے کہ قرآن کریم اسلامی ثقافت کا مرہونِ منت نہیں، بلکہ اسلام کی تمام

---

[1] دی عربس صفحہ ۱۱۴ (The Arabs By Philip K. Hitti P. 114)

تخت و کرسی و محاریب وتماثیل و قدور راسیات (بڑی بڑی دیگیں) صافنات الجیاد (قیمتی گھوڑے) ہر قسم کے بنّاء (معمار) غوّاص (غوطہ زن) جنود (افواج) سب ہی چیزوں کا ذکر کرتا ہے، اور ان تمام امور کو قرب الٰہی کے مقامات عالیہ کے منافی نہیں قرار دیتا، تو مجھے ان پر تعجب نہیں ہے جو اپنے جہل کی وجہ سے بعض مسلمانوں کے طرز عمل کو دیکھ کر اسلام کو بھی ایک قسم کا راہبانہ مذہب قرار دینا چاہتے ہیں، بلکہ حیرت اُن پر ہے جو یہ جاننے کے باوجود کہ "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے" اس بدیہی دعوے کو نظری قرار دے کر اُس کے ثبوت میں بلا وجہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں، اور بعض کمزور یا ضعیف روایتوں سے استدلال کر کے گویا باور کراتے ہیں کہ خدانخواستہ اگر یہ چند روایتیں نہ ہوتیں تو اعتراض کرنے والوں کا گویا اعتراض باقی رہ جاتا[1]"

اسی سلسلے میں مولانا گیلانی نے ان علوم و فنون کی ایک لمبی فہرست گنانے کے بعد جن کا ذکر ضمنی طور پر قرآن مجید میں کیا گیا ہے لکھا ہے "اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشی امور سے قرآن مسلمانوں کو کتنا قریب رکھنا چاہتا ہے[2]"

مشہور عیسائی مورخ فلپ کے ہٹی نے اپنی کتاب "دی عربس" The Arabs میں علم طب، فلسفہ، ادب، نجوم، ریاضی، جبر و مقابلہ، کیمیا، تاریخ، جغرافیہ، قانون وغیرہ کے علاوہ اور بہت سے ان علوم و فنون کا ذکر کرتے ہوئے کہ جن کی ایجاد اور ترقی میں مسلمان نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن مسلمان علماء اور ماہرین فنون کے نام لکھے ہیں کہ جو قابلیت میں اپنی نظیر نہ رکھتے تھے، بلکہ ان مسلمان خلفاء اور سلاطین

---

[1] اسلامی معاشیات صفحہ ۴۔۵ [2] ایضاً صفحہ ۶

بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ سب کچھ جانتا ہے، یہ دعویٰ تو صرف اُس ذات کے لئے سزاوار ہے جو علیم وخبیر، علاّم الغیوب اور مصدر علم وحکمت ہے۔ اگر وہ ایسا دعویٰ کرے گا بھی تو آنے والے زمانے کی ایجادات اور اسکی ترقیاں بہت جلد اس کو جھٹلا دیں گی۔ اسی طرح انسان کو اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ اگر وہ کوشش میں لگا رہے تو جن باتوں کو وہ اب تک نہیں جان سکا ہے، ان کا علم اس کو تلاش وجستجو اور علمی تحقیق Research کے ذریعے ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ کیسے کیا جائے؟

کسی کتاب کو پڑھنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، اور ہر ہر طریقہ افادیت میں کمی و بیشی کے لحاظ سے مختلف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے بار بار قرآن کے پڑھنے والوں کو فکر و تدبّر کی طرف متوجہ کیا ہے، کہیں بتا دیا ہے کہ یہ یہ باتیں غور کرنے اور سوچنے کی ہیں، اور کہیں پڑھنے والے پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان کو خود سوچے اور جو باتیں جواب طلب ہے اس کا جواب اپنے دل و ضمیر سے مانگے۔ اللہ کا انسان سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ خود اچھا بنے اور دوسروں کو اچھا بنائے۔ اب انسان کو یہ سوچنا ہے کہ اس کا اچھا بننا کیوں ضروری ہے؟ کیا اپنے آپ کو اچھا بنائے بغیر وہ دوسروں کو اچھا بنا سکتا ہے؟ دوسرے انسانوں کے اچھے بن جانے سے اُس کو کیا فائدہ پہنچے گا؟ اللہ کے نزدیک کون انسان اچھا ہے؟ ایک انسان دوسرے انسان کو کب اچھا کہتا اور سمجھتا ہے؟ اللہ نے جن باتوں اور کاموں سے

ثقافتی اور تمدنی ترقیاں اس کتاب کی بدولت ہوئی ہیں[1]"

قرآن کریم کی نیچے لکھی ہوئی آیت کے متعلق پکتھال نے اپنے اسی لیکچر میں

" حال میں سائنس کی جدید ترین تحقیقات سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ دنیا کی ہر
کا جوڑا نر و مادہ کی شکل میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ سنگی بلور اور بجلی میں بھی[2]"

سُبْحَانَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ (یٰسین)	وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا، نباتات زمین کے قبیل سے بھی اور ان آدمیوں سے بھی اور ان چیزوں میں بھی جن کو لوگ نہیں جانتے (بیان القرآن)

اس آیت کا آخری حصہ "وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ" جس کا صاف مطلب یہ نکلتا ہے کہ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں کہ جو فی الواقع موجود ہیں، لیکن ان کا علم انسانوں کو ابھی تک نہیں ہوا ہے، جس زمانے میں قرآن کریم نازل ہو رہا تھا اُس وقت بہت سی ایسی چیزیں تھیں کہ موجود ہونے کے باوجود انسان اُن سے واقف نہ تھا۔ اور رفتہ رفتہ ان کا انکشاف ہوا، یہ نئی نئی ایجادات جو چند صدیوں سے ہو رہی ہیں، اور ہوتی جارہی ہیں "مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ" ہی میں سے تھیں، اور جن باتوں اور چیزوں تک انسان علوم کی مدد سے اس وقت تک نہیں پہنچ سکا ہے اور آئندہ پہنچے گا، وہ بھی "مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ" (ان چیزوں میں سے جن کو لوگ نہیں جانتے) ہی کی فہرست میں داخل ہیں۔

"مِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ" کہہ کر قرآن نے انسان کو آگاہ کر دیا کہ وہ کسی وقت

---

[1] ملخص از دی کلچرل سائڈ آف اسلام صفحہ ۶۶ [2] ایضاً صفحہ ۶۸

پورا اہتمام کیا ہے، لیکن اس سے وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جن کے سامنے وہ دشواریاں اور اُلجھنیں ہوں، وہ ان کا حل بھی چاہتے ہوں، اور قرآن کی تلاوت کے وقت وہ ان کے دل ودماغ میں موجود رہتی ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ آج نوعِ انسانی خطرناک حد تک قوموں، حکومتوں اور گروہوں کی شکل میں بٹ چکی ہے، مختلف نظریئے رکھنے والی حکومتیں ایک دوسرے کو نیست ونابود کر دینے پر تلی ہوئی ہیں۔ سوچنے اور غور کرنے کی بات ہے کہ یہ منافرت کیسے دور ہوسکتی ہے؟ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ نوعِ انسانی صرف خدا پرستی کے رشتہ ہی سے متحد ہوسکتی ہے۔ قرآن کہتا ہے، دینِ الٰہی کی اصل اور اس کا مطمح نظر نوعِ انسانی کی وحدت و اخوت ہے، نہ کہ آپس کی پھوٹ اور منافرت۔ یہ تمام گروہ بندیاں جو ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے نفرت دلاتی ہیں سچائی کی راہ نہیں دکھا سکتیں، اللہ کا دین یعنی دینِ اسلام ہی عالمگیر صداقت ہے، اور اس کے سوا انسانوں کی خود ساختہ گروہ بندی یقیناً سماج اور انسانیت کے لئے نہ صرف خطرناک اور نقصان دہ بلکہ ہلاکت میں ڈالنے والی ہے۔ ہر تلاوت کرنے والے کے سامنے قرآن کی بتائی ہوئی اس قسم کی بہت سی باتیں موجود ہیں کہ جن پر غور وفکر اور عمل کے ذریعے وہ دنیا اور دین کی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

قرآن پر عمل کرنے والا شخص ایک خاص قسم کی روحانی خوشی محسوس کرتا ہے۔ گناہ کی زندگی بسر کرنے والا بظاہر کتنا ہی خوش نظر آئے، لیکن اس کا دل کمھلایا ہوا رہتا ہے، اور دوسرے لوگ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا خوش نصیب ہے، خوب مزے اُڑا رہا ہے۔

روکا اور جن کے کرنے کا حکم دیا ہے اُن کے کرنے اور نہ کرنے سے، کیا اللہ تعالیٰ کا کوئی فائدہ ہے، یا ان کے فوائد انسان اور انسانیت ہی کی طرف لوٹتے ہیں؟ جھوٹ بولنے، حسد، غیبت، ظلم اور چوری وغیرہ دوسری برائیوں کے کرنے سے سماج میں کیا کیا خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور سچ بولنے، تواضع، انکساری، رحم و کرم، حسن سلوک، عفو و درگزر اور انصاف وغیرہ اچھائیوں کے کرنے میں نوعِ انسانی اور انسانیت کا کیا فائدہ ہے؟ ان میں سے بہت سی باتوں کے جوابات قرآن کے مطالعہ کرنے والوں کو اس میں مل جاتے ہیں، کہیں تو صاف عبارت میں اور کہیں اشارے کے طور پر، اور وہ انسان کی عقل کے دیئے ہوئے جوابات کے لگ بھگ ہوتے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جن جن باتوں سے انسان کو دوچار ہونا پڑتا ہے، اور انسان اپنی فطری خواہش و رجحان کے تقاضے کی بنا پر یہ چاہا کرتا ہے کہ اس زندگی کو چین و سکون سے گزار دے، قرآن نے اِس فطری خواہش کو پورا کرنے میں انسان کی پوری پوری مدد اور رہبری کی ہے، ہر گتھی کو اُس کی نفسیات میں ڈوب کر سلجھا دیا ہے، اور کسی ایک موقعے پر بھی انسان کے فطری مطالبے کو ٹھکرا کر اس کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں اور واقعات ہوتے ہیں جو برابر انسان کو پیش آتے رہتے ہیں، جن سے افراد کے دماغوں میں اُلجھن اور سماجی زندگی میں انتشار و بے چینی پیدا ہوتی ہے، لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا کوئی صحیح حل مل جائے تو پریشانیوں سے چھٹکارا ملے۔ اس قسم کی اُلجھنوں کو دور کرنے کا قرآن کریم نے

بڑے استقلال اور جوانمردی سے یہ کہتے ہوئے برداشت کرتا ہے۔

ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش
میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند (اقبالؒ)

قرآن کریم کے معانی سمجھے بغیر جوشِ عمل پیدا نہیں ہو سکتا

کلمہ طیبہ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ) پڑھ کر ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنی ساری زندگی اللہ اور اس کے رسول کے سپرد کر دیں گے، ہمارے تمام کام اللہ کی مرضی کے تابع اور سنّت نبوی کے مطابق ہوں گے۔ اس وعدے اور عہد پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم کو قرآن اور حدیث سے واقفیت ہو، حدیث نبوی کی اہمیت کا ذکر آگے مفصّل آئے گا۔ قرآن مجید کے معانی سمجھنے والا بڑی آسانی سے سمجھ لیتا ہے کہ اس دستور العمل اور ہدایت نامے میں اللہ تعالیٰ نے بندوں سے کن کن باتوں پر عمل کرنے کا حکم دیا ہے اور کن باتوں سے روکا ہے، قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے معانی ومطالب کا سمجھنا کچھ اس پر موقوف نہیں ہے کہ عربی زبان سے گہری واقفیت حاصل کی جائے۔ قرآن کریم اور احادیث نبویہ کے بہت سے اچھے ترجمے انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں موجود ہیں، ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں ایسی کتابیں اردو زبان میں موجود ہیں کہ جن کی مدد سے معمولی لکھا پڑھا انسان بڑی آسانی سے قرآن کے احکام اور تعلیمات نبوی کو سمجھ سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ براہِ راست قرآن مجید اور احادیث نبویہ سے مطالب

تجربہ شاہد ہے کہ جو شخص قرآنی ہدایات کے مطابق تقویٰ اور پرہیزگاری کی زندگی بسر کرتا اور گناہوں سے بچتا رہتا ہے وہ اپنی آخرت تو بنا ہی لیتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُس کی دنیا بھی بن جاتی ہے، اس کا دل و دماغ بُرے خیالات سے پاک وصاف رہتا ہے، فضول قسم کی فکریں اس کے پاس نہیں آتیں، دنیوی حرص وطمع سے وہ کوسوں دور رہتا ہے، دوسروں کی دولت اور نعمت کو دیکھ کر وہ حسرت نہیں کرتا، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے اس پر قانع اور شاکر رہتا ہے، مصیبتوں پر صبر کرنا اور معمولی سی نعمت پر شکر کرنا اس کا شیوہ ہوتا ہے، وہ دنیا کو چند روزہ سمجھ کر اس کی ظاہری شان وشوکت پر نہیں پھولتا، اور نہ مصیبتوں سے گھبرا کر اُس کے دل پر مایوسی کی گھٹا چھا جاتی ہے، آسمانی تعلیمات پر عمل کرنے کی وجہ سے اس کے اخلاق اچھے ہوجاتے ہیں، وہ سب کے نزدیک محبوب ہوجاتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں اس کی عزت و وقعت پیدا ہوجاتی ہے، توکّل کا مطلب اُس کے نزدیک بےکار رہ کر خدا پر بھروسہ کرنا نہیں ہوتا، وہ ہر کام سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ اس کا یہ کام خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف تو نہیں ہے، ایسا شخص مردِ مومن کہلاتا ہے، وہ خدا کے ڈر کے سوا کسی اور کے خوف و ڈر کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا، حق اور سچائی کی خاطر وہ بڑی سے بڑی باطل قوت کے سامنے مقابلے کے لیے آجاتا ہے، اور موت سے وہ اس لئے نہیں ڈرتا کہ اُس کو ہر دم اس بات کا پورا الیقین رہتا ہے کہ وہ تو ایک بار آکر رہے گی، اور جو چیز ایسی یقینی ہو اس سے ڈرنا شانِ ایمان کے خلاف ہے، حق اور سچائی کا راستہ اختیار کرنے میں جن تکلیفوں اور اذیتوں کا اس کو سامنا ہوتا ہے اُن کو وہ

عدیم الفرصتی کے باوجود تھوڑا سا وقت نکال کر چند مہینوں میں ضرورت کے مطابق عربی سیکھ لیتے ہیں۔

اوپر لکھے ہوئے طریقے کے مطابق ترجمۂ قرآن سیکھتے وقت اگر سیرتِ نبوی اور صحابہ کرام کے حالات پر لکھی ہوئی دو چار کتابیں پڑھ لی جائیں تو حصولِ مقصد میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرائض منصبی گناتے ہوئے فرمایا۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (الجمعۃ)

وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا، جو اُن کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، اور اُن کو پاک کرتے ہیں، اور اُن کو دانش مندی سکھاتے ہیں، اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔ (بیان القرآن)

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو معلّم قرآن بنا کر بھیجا گیا تھا، اس لئے آپ صحابہ کرامؓ کو قرآن سیکھنے اور دوسروں کو سکھانے کی طرف برابر توجہ اور شوق دلاتے رہتے تھے۔

حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا۔

"تم میں افضل وہ لوگ ہیں جنھوں نے قرآن کی تعلیم حاصل کی اور دوسروں کو تعلیم دی"[1]

عبداللہ ابن عمرؓ نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے نقل کیا ہے کہ دلوں کو بھی

---

[1] بخاری شریف

ومعانی سمجھنے میں جو لطف محسوس ہوتا ہے وہ ترجمۂ قرآن یا دوسری کتابوں کی مدد سے سمجھنے میں نہیں ہوتا۔ عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن کے معانی سمجھنے، اور آیاتِ قرآنی سے مطلب نکالنے کے لئے برسوں عربی پڑھنے کی ضرورت ہے، کیونکہ عربی گرامر بہت مشکل ہوتی ہے، اس میں بڑی بڑی لمبی گردانیں ہوتی ہیں جن کا یاد کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ یہ بات ضرور قابلِ تسلیم ہے کہ عربی گرامر مشکل ہوتی ہے، لیکن نہ اتنی مشکل کہ کوئی شخص اگر اس کے سیکھنے کی طرف توجہ کرے اور تھوڑی بہت دلچسپی لے تب بھی کچھ نہ سیکھ سکے، عربی کا ماہر بننے کے لئے تو کافی وقت اور محنت کی ضرورت ہے، لیکن اتنی عربی سیکھ لینا کہ جس کے سیکھنے کے بعد تھوڑا بہت قرآن کا ترجمہ اور حدیثوں کا مطلب سمجھنے لگے چنداں مشکل نہیں۔

اس کا تجربہ کیا جا چکا ہے کہ اگر لفظی ترجمہ والے قرآن میں آیت کے ساتھ ساتھ پڑھنے والا ذرا توجہ اور دھیان سے اُس کے نیچے لکھا ہوا ترجمہ پڑھتا رہے اور اس پر غور کرتا رہے کہ کس لفظ کے کیا معنی ہیں، اور اس طرح سے تین چار بار قرآن ختم کرلے تو وہ قرآن کی اکثر آیتوں کا ترجمہ بغیر دیکھے کرنے لگے گا، لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک آسان سی ابتدائی عربی قواعد کی کتاب کسی عربی داں سے پڑھ لے، اور پڑھانے والے کو چاہیئے کہ قواعد کی مشق آیاتِ قرآنی سے کرائے۔

دنیا میں اور بھی بہت سی مشکل زبانیں ہیں۔ لیکن وہی لوگ جو عربی زبان کو بہت مشکل کہتے ہیں دنیوی نفع کی خاطر تھوڑی سی توجہ اور محنت سے جس زبان کو چاہتے ہیں سیکھ لیتے ہیں۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جن اللہ کے بندوں کو یہ لگن ہوتی ہے کہ وہ اتنی عربی سیکھ جائیں کہ اللہ سے ہم کلام ہونے لگیں تو اپنی مصروفیت اور

حدیث

پہلے بھی یہ ہوا اور آج بھی ہو رہا ہے کہ ترقی چاہنے والا انسان حال کی تعمیر میں ماضی کے تجربات اور واقعات سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے، ہزاروں برس کے گزرے ہوئے واقعات کی کڑیاں ملا کر اُن سے صحیح نتیجہ نکال لینا کوئی آسان کام نہیں لیکن ترقی اور حال کی تعمیر کا خیال انسان سے سب کچھ کرا لیتا ہے، قومیں اپنے علم و دولت کا کافی حصّہ خرچ کر کے اپنے پرانے واقعات کا پتہ چلا رہی ہیں، اور اسی کا نام تاریخ ہے، تاریخ تو بڑی احتیاط چاہتی ہے، لیکن یہ بھی دیکھنے میں آ رہا ہے کہ حال کو ماضی سے ملانے کا والہانہ شوق وہمی اور خیالی باتوں کو بھی واقعہ بنائے دے رہا ہے، جس سے تاریخ مرتّب کرنے میں اگرچہ خاصی مدد مل جاتی ہے۔ لیکن واقعات کے ایسے ناقص مجموعے سے حال کی تعمیر و ترقی میں کچھ زیادہ مدد نہیں ملتی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علم تاریخ کی اہمیت اور ضرورت کو دنیا کی اکثر آبادی نے تسلیم کر لیا ہے۔

زنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگ جاتا ہے، پوچھا گیا کہ حضور ان کی صفائی کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے، آپ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا، اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

"وہ گھر جس میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس میں زیادہ برکت ہوتی ہے۔"

قرآن پاک کی تلاوت کے وقت پاک و صاف ہونا ضروری ہے، قرآن باوضو قبلہ رو ہوکر پڑھیں اور پڑھتے وقت دل میں یہ خیال کریں کہ ہم اللہ تعالیٰ کا کلام اسی کے حضور میں پڑھ رہے ہیں، اور اُس سے ہمکلام ہیں، وہ ہم کو دیکھ رہا ہے، اور ہماری آواز سن رہا ہے، اس طریقے سے تلاوت کرنے سے یقیناً کچھ نہ کچھ اثر ہوگا۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف (اقبالؔ)

جس وقت کوئی تلاوت کر رہا ہو تو پاس بیٹھے ہوئے لوگوں کو خاموشی سے سننا چاہیئے، اور شور و غل نہ کرنا چاہیئے۔ قرآن کریم پڑھنے والے کو چاہیئے کہ وہ ایسا کوئی طریقہ اختیار نہ کرے کہ جس سے قرآن کریم کی بے ادبی کی نوبت آئے، مثلاً یہ مناسب نہیں کہ لوگ تو بیٹھے باتیں کر رہے ہوں اور کوئی شخص ان کے بیچ میں جا کر قرآن پڑھنا شروع کر دے، اور اُن سے خاموش رہنے کا مطالبہ کرنے لگے، اس سلسلے میں بہت سی ایسی باتیں ہیں کہ جن کا بتانا ضروری نہیں بلکہ ان کا تعلق عام فہم انسانی سے ہے۔

جس طرح سے تاریخ بنی اور بن رہی ہے، کیا اسی طرح سے احادیث نبویہ کا ذخیرہ بھی جمع ہو گیا؟ اور کیا جس طرح سے کہ اکثر تاریخی واقعات صدیوں کے بعد جمع کیے گئے، حدیثیں بھی اسی طرح محفوظ کی گئیں؟ اس کا جواب مختصر طور پر آئندہ صفحات میں دیا گیا ہے۔

حدیث کی جو تعریف اوپر کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث اس تاریخ کا نام ہے جس کا براہِ راست تعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے ہے، اس کے برخلاف ہمارے پاس اس وقت تاریخ کے جو عام ذخیرے ہیں اُن کا تعلق کسی قوم کی حکومت، کسی بڑی جنگ، یا اسی قسم کی منتشر اور مختلف چیزوں سے ہے، جن کو سمیٹ کر صحت کے ساتھ ایک جگہ جمع کر دینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک شخص کے حالات جمع کرنے میں غلطی کا امکان کم ہے، اور قوموں یا حکومتوں کے حالات جمع کرنے میں زیادہ۔

صحابۂ کرامؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو قلبی لگاؤ تھا، وہ دینی یا دنیوی اعتبار سے کسی بڑی سے بڑی تاریخی شخصیت اور اس کے متعلقین میں ہم کو نظر نہیں آتا، یہی نہیں کہ صحابہ کرامؓ نے آپ کے ہاتھ پر ایمان و اسلام کی بیعت کی تھی، آپ پر ایمان لے آئے تھے، اور آپ سے اُن کو ویسا ہی لگاؤ تھا جیسا کہ ایک اُمّتی کو اپنے پیغمبر سے ہونا چاہیئے، واقعات تو یہ بتاتے ہیں کہ صحابہ کرام کو جس درجے کی آپ سے محبّت تھی اس کو کسی پیمانے سے بھی ناپا نہیں جا سکتا، وہ لوگ اپنے ماں، باپ، بیوی، بچوں بلکہ اپنی جانوں سے بھی زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز رکھتے، اور سب کچھ آپ پر قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے، ان ہی لوگوں کے ذریعے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات ہم تک پہنچے ہیں، یقیناً یہ ایسا امتیاز

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا سرزمینِ عرب میں مبعوث ہوکر مذہبی اور سماجی زندگی کے علاوہ اس کے دوسرے شعبوں میں بھی انسانیت کا رُخ پلٹ دینا، اور سرزمینِ عرب سے گزر کر نسلِ انسانی کی ایک بڑی آبادی کے زندگی کے دھارے کو بدل دینا کوئی معمولی واقعہ نہیں بلکہ بہت بڑا واقعہ ہے، اور ایسا واقعہ کہ جس نے ایک مستقل تاریخ بنائی جس کو کہ حدیث کہا جاتا ہے۔

حدیث کی تعریف

جن باتوں اور کاموں کے متعلق یہ ثابت ہوجائے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے یہ فرمایا، یا یہ کیا ان کو حدیث کہا جاتا ہے، اسی طرح وہ واقعات بھی حدیث کی فہرست میں داخل ہیں کہ جو آپ کے سامنے پیش آئے، اور آپ نے اُن پر خاموشی اختیار فرمائی اس کو اصطلاحِ حدیث میں تقریر کہا جاتا ہے، حدیث کے متعلق محمد اسد "اسلام ایٹ دی کراس روڈ" میں لکھتے ہیں۔

"سنّت کا لفظ یہاں کسی قدر وسیع معنی میں استعمال کیا گیا ہے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے وہ اقوال وافعال جو نمونۃً آپ نے ہمارے سامنے پیش کئے، آپ کی قابلِ تعریف زندگی قرآن کریم کی جیتی جاگتی تصویر اور کھلی ہوئی تفسیر تھی اور جس قرآن کی وحی کے آپ ترجمان تھے اس کے ساتھ سب سے بڑا انصاف یہ ہے کہ آپ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی جائے[1]"

---

[1] اسلام ایٹ دی کراس روڈس صفحہ ۱۰۲ Islam at the Cross-roads By Muhammad Asad P 102

علیہ وسلم صحابہ کرام کو ارشادات نبوی محفوظ رکھنے کے لئے کس قدر تاکید فرمایا کرتے تھے۔

ایک موقعے پر صحابہ کرام کے بہت بڑے مجمعے کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

نَضَّرَ اللّٰهُ عَبْدًا سَمِعَ مَقَالَتِيْ فَوَعَاهَا ثُمَّ أَدَّاهَا إِلٰى مَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا (صحاح)	اللہ اس بندے کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اُسے یاد رکھا، اور جس نے نہیں سنا ہے اُس تک میری بات کو پہنچا دیا۔

آپ نے خطبہ حجۃ الوداع کو اس مشہور فقرے پر ختم کیا۔

أَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (صحاح)	سنو! جو حاضر ہے اُس کو چاہئے کہ وہ غائب تک پہنچا دے۔

جس اثر انگیز ماحول میں حجۃ الوداع کے خطبے کو ختم کیا گیا، اس سے متأثر ہو کر صحابۂ کرام نے آپ کے زمانۂ حیات میں اور آپ کے وصال کے بعد تعلیمات نبویہ کو دوسروں تک پہنچانے میں جس شغف و انہماک سے تن من دھن کی بازی لگا دی، وہ اسلامی تاریخ کے جاننے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ قرآن اور اُسوۂ حسنہ کی تعلیمات نے صحابۂ کرام کی ذہنی قوتوں اور عملی توانائیوں میں نئی زندگی کی روح پھونک دی تھی، ذاتِ گرامی سے محبت اور عقیدت کی وجہ سے وہ لوگ ہر کام میں سنت نبوی کی پیروی کو راہِ نجات سمجھتے تھے۔

عروہ بن مسعود ثقفی جو صلح حدیبیہ تک مسلمان نہ ہوئے تھے، قریش کی طرف سے دربارِ نبوی میں بھیجے گئے، وہاں جب انھوں نے شمع نبوت کے پروانوں کی جاں نثاری دیکھی تو حیران رہ گئے اور واپس جا کر قریش سے قسم کھا کر جو الفاظ

ہے کہ جو کسی تاریخی واقعے کو اپنے مورخین کے ساتھ حاصل نہیں، اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تاریخ اور حدیث میں کیا فرق ہے۔

قرآن مجید پر ایمان لانے والوں کو بار بار یہ حکم دیا گیا ہے کہ رسول کی باتوں کو غور سے سننا اسن کے یاد رکھنا، اور ان پر عمل کرنا توحید کے ہر پرستار کی زندگی کا سب سے بڑا نصب العین ہونا چاہیئے۔

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ ہ (آل عمران)	(اے پیغمبر!) تم کہہ دو (فلاح وسعادت کی راہ تمہارے لئے ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ) اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو (اطاعت الہٰی سے روگرداں ہونا شیوۂ کفر ہے اور) اللہ کفر کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ (ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۸۷)

دوسری جگہ کہا گیا۔

وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ج وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَا اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ہ (النساء)	جس کسی نے اللہ کے رسول کی اطاعت کی، تو اس نے فی الحقیقت اللہ کی اطاعت کی، اور جس کسی نے روگردانی کی، تو (اے پیغمبر!) ہم نے تمہیں ان پر کچھ پاسبان بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ ان کے اعمال کے لئے تم جوابدہ ہو، اور جبراً ان سے اپنی اطاعت کراؤ) (ترجمان القرآن جلد اول صفحہ ۳۵۲)

یہ تو قرآن کریم کی ترغیب تھی، اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ

فنِ رجال کے مشہور امام ابوزرعہ رازی کی ذیل میں لکھی ہوئی عبارت کو "تدوینِ حدیث" میں مولانا گیلانی نے نقل کیا ہے، اور خود بھی اصل مرجع میں یہ عبارت میں نے دیکھی ہے۔

تُوُفِّيَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَنْ رَأٰهُ وَسَمِعَ مِنْهُ زِيَادَةً عَلٰى مِائَةِ اَلْفِ اِنْسَانٍ مِنْ رَجُلٍ وَّامْرَءَةٍ كُلُّهُمْ قَدْ رَوٰى عَنْهُ سِمَاعًا وَّرُؤْيَةً۔	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم وفات پا گئے اور جن لوگوں نے آپ کو دیکھنے اور آپ سے سننے کے بعد آپ سے روایت کی اُن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، جس میں مرد اور عورتیں سب ہی شامل ہیں۔

قرآن کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصد ذیل کی آیت میں بیان کیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آلِ عمران)	حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب کہ اُن میں اُن ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر کو بھیجا کہ وہ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ سناتے ہیں اور ان کی صفائی کرتے ہیں، اور اُن کو کتاب اور فہم کی باتیں بتاتے رہتے ہیں، اور بالیقین یہ لوگ قبل سے صریح غلطی میں تھے۔ (بیان القرآن)

اوپر لکھی ہوئی آیت میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے، کہ آپ لوگوں کو کتاب (قرآن) اور حکمت کی باتیں بتاتے ہیں، حکمت کا

---

[۱] تدوین حدیث صفحہ ۸۰، [۲] اصابہ ج ۱ ص ۳

کیے، ان کی تفصیل تو صحیح بخاری میں پڑھئے، یہاں صرف اُن کے چند جملوں کا حاصل درج کیا جاتا ہے۔

"مجھے قیصر، (روم) کسریٰ (ایران) اور نجاشی (ابی سینیا) کے بادشاہوں کے درباروں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے، خدا کی قسم میں نے کسی بادشاہ کو نہیں دیکھا جس کی لوگ اتنی عزت کرتے ہوں جتنی محمدؐ کے ساتھی محمدؐ کی عزّت کرتے ہیں، جب وہ کسی بات کا حکم دیتے ہیں تو اس کی تعمیل کے لئے ہر شخص ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے، جب وہ وضو کرتے ہیں تو وضو کے پانی کو تبرک سمجھ کر آپس میں اُلجھ پڑتے ہیں، جب وہ باتیں کرتے ہیں تو اُن کے ساتھیوں کی آوازیں نیچی ہو جاتی اور وہ لوگ عظمت کی وجہ سے اُن کو نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتے"۔[1]

اس موقعے پر گاڈفری ہیگنس کے ان الفاظ کا جن کا مولانا گیلانی نے "تدوینِ حدیث" میں اور مولانا سیّد سلیمان ندوی نے "خطباتِ مدراس" میں ذکر کیا ہے، نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰ (علیہ السلام) کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے"۔

جس کو معلّمِ انسانیت بنا کر بھیجا گیا ہو، اور اس کو پروانہ وار نثار ہونے والے ہزاروں لائق شاگرد مل جائیں، بھلا اس کی تعلیمات کہیں مردہ ہو سکتی ہیں، اور معلّم بھی ایسا کہ جو تاریک دلوں کو نورِ نبوّت سے روشن کر دینے والا ہو۔

---

[1] تدوینِ حدیث صفحہ ۲۰ (مولانا مناظر احسن گیلانی)

یہ ناطق، یہاں تیسری چیز احادیث رسول تھیں، یہ بھی قرآن ہی کی ایک شکل تھی، مگر وہ مجمل تھا یہ مفصل، یہ تینوں قرآن گو بلحاظ اجمال و تفصیل جدا جدا تھے، مگر بلحاظ اصل حقیقت یہ ایک ہی قرآن تھا۔[1]

حدیث کی ضرورت

قرآن کریم کی جن آیات کا مطلب سمجھنے میں صحابہ کرام کو دقت محسوس ہوتی، یا آیت کا ظاہری مطلب سمجھنے کے بعد کوئی شبہ ہوتا تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کر لیا کرتے تھے، حدیث کی مستند کتابوں میں اُن آیات کا وہ مطلب جو زبانِ فیض ترجمان نے بیان فرمایا آج بھی موجود ہے، اور اس قسم کی ایک دو نہیں سینکڑوں آیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ○ (النحل)	ہم نے رسولوں کو روشن دلیلوں اور کتابوں کے ساتھ بھیجا تھا، اور (اسی طرح) تجھ پر بھی "الذکر" (یعنی قرآن) نازل کیا، تاکہ جو تعلیم لوگوں کی طرف بھیجی گئی ہے، وہ اُن پر واضح کر دے، نیز اس لئے کہ وہ غور و فکر کریں، (اور ہدایت کی راہ پالیں) (ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۱۴)

اتباعِ سنّت کے بغیر قرآن کے احکام پر عمل ممکن نہیں

قرآن کو ایک جامع کتاب کہا جاتا ہے، لیکن اس کے جامع ہونے کا یہ مطلب

---

[1] ترجمان السنۃ صفحہ ۱۰۷ جلد ۱، تالیف استاذ الحدیث مولانا بدر عالم میرٹھی)

مطلب حکمتِ قرآن ہے، قرآن کریم میں جن باتوں کا حکم دیا گیا یا جن سے روکا گیا ہے، اور اس کی وہ آیتیں کہ جن کے ذریعے احکامات، ارشادات اور پند و نصائح وغیرہ بیان کئے گئے ہیں ان کا صحیح علم جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو عطا کیا گیا، اس کا نام "حکمت" ہے، اور اسی حکمت کو آپ صحابہ کرام کو سمجھاتے، بتاتے اور خود اس کے مطابق عمل کرتے تھے، گویا آپ کی زندگی سراپا حکمت اور قرآن کی عملی تفسیر تھی۔

مشہور مفسرِ قرآن حافظ عماد الدین نے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ کی تفسیر اَلْقُرْآنَ وَالسُّنَّةَ سے کی ہے، یعنی کتاب سے قرآن کریم اور حکمت سے حدیث مراد لی ہے۔[1]

اسوۂ رسول کی جامعیت بیان کرتے ہوئے ترجمان السنۃ کے مؤلف لکھتے ہیں۔

" احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف کسی خاص شعبۂ زندگی کا نمونہ نہیں بنایا تھا، بلکہ جو کچھ قرآن میں کہا گیا تھا، وہ سب یہاں دکھا دیا گیا تھا، ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا آپ کے اخلاق کیا تھے، فرمایا کہ یہ قرآن ہی آپ کا خلق تھا، خلق میں اقوال اور افعال سب داخل ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ آپ کا کوئی قول کوئی فعل ایسا نہ تھا جو قرآن سے باہر ہو، گویا اسوۂ رسول کی جامعیت بھی کتاب اللہ کے ہم رنگ تھی، اسی لئے آپ کی ذات کو بلا کسی تفصیل کے تمام عالم کے لئے اسوہ بنا دیا گیا تھا، ایک طرف خدا کی یہ جامع کتاب موجود تھی، دوسری طرف یہ جامع اسوہ موجود تھا، خلاصہ یہ کہ ایک قرآن بشکلِ مصحف تھا اور دوسرا بشکلِ اسوۂ رسول، فرق یہ تھا کہ وہ خاموش تھا،

---

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۲۴۴ جلد ۱

کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کی سب بڑے سلیقے سے قرآن کریم سے مستنبط کی گئی ہیں[۱]"

نماز کا ذکر تو مثال کے طور پر کیا گیا ہے ورنہ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کو سنّتِ نبوی اور احادیث کی مدد کے بغیر سمجھنا مشکل ہے۔

"عمران بن حصین سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک شخص سے فرمایا تو احمق ہے، کیا قرآن میں کہیں ظہر کی چار رکعتیں اور ان میں جہر نہ ہونا مذکور ہے، اس کے بعد فرمایا۔

اِنَّ كِتَابَ اللّٰهِ اَبْهَمَ هٰذَا وَاِنَّ السُّنَّةَ تَفْسِيْرُ ذٰلِكَ	کتاب اللہ (قرآن) نے اُس کو مبہم (صاف بیان نہیں کیا) رکھا پھر سنّتِ رسول نے اس کی تفسیر کر دی[۲]۔

فقہ کا سرچشمہ بھی قرآن و احادیث ہیں

امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں جو صحیح بخاری کے نام سے مشہور ہے احادیث کو اس طریقے سے جمع کیا ہے کہ جس سے نہ صرف سنّتِ نبوی بلکہ فقہ کی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے، انھوں نے بہت سے فقہی مسائل کو عنوان بنا کر ان کے ذیل میں احادیث مرفوعہ اور آثار صحابہؓ کو پیش کیا ہے، تاکہ حدیث و فقہ کا ربط و تعلق ظاہر ہو جائے، پھر عنوان اور احادیث کے مناسب قرآن کریم کی آیات لکھ دی ہیں۔ یہ طریقہ انھوں نے صرف یہ بتانے کے لئے اختیار کیا کہ فقہ کے احکام کا منبع اور سرچشمہ قرآن اور احادیث رسول ہیں، اور ان دونوں میں گہرا

---

[۱] حاشیہ شاہ ولی اللہ نمبر طبع دوم صفحہ ۲۸۰ بحوالہ خیر کثیر [۲] ترجمان السنۃ صفحہ ۱۱۷۰

نہیں ہے کہ وہ اپنی آیات کی تشریح وتفسیر میں احادیث اور سنتِ نبوی کا محتاج نہیں ہے، بلکہ اس کی جامعیت کا یہ تقاضہ ہے کہ اس کے اصول و دفعات کی تشریح وتفصیل کی جائے، اور اس کے اشارات کو صاف الفاظ کے ذریعے بیان کیا جائے۔ کسی کتاب کے جامع ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں بکھری ہوئی اور طرح طرح کی جزئیات کے احکام اس ڈھنگ سے بیان کردئے جاتے ہیں کہ کم عبارت میں زیادہ سے زیادہ معانی ومطالب ادا ہوجائیں۔ اصطلاحی الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ جزئیات کے احکام کو کلیات کی شکل میں بیان کردیا جائے، امام شاطبیؒ نے اپنی کتاب "الموافقات" میں قرآن کے جامع ہونے کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

قرآن میں نماز کی جس قدر تاکید کی گئی ہے وہ ظاہر ہے، ان تمام آیات قرآنی کو سامنے رکھ کر جن میں کہ مختلف جگہ نماز کا حکم دیا گیا ہے اور قیام، رکوع اور سجدے کا ذکر ہے، ایک بڑے سے بڑا ماہر عربی داں نماز کا وہ طریقہ نہیں سمجھ سکتا جس طریقے سے وہ پڑھی جاتی ہے، قرآن سے نماز کا صحیح طریقہ سمجھنے کے لئے وہ یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کا محتاج ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب "خیر کثیر" میں قرآن کریم کی تفسیر اور اس سے مسائل نکالنے کو علوم الحدیث کی ایک قسم بتلایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں قیام، تکبیر، تلاوت قرآن، رکوع اور سجدے کا حکم دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ نماز کے ارکان ہیں، نماز کے بارے میں جتنی حدیثیں میرے علم میں ہیں، اُن پر

حدیثوں کے یاد کرنے میں صحابہؓ کا اہتما

صحابہ کرامؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت و عقیدت تھی اُس کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ وہ آپ کی بتائی ہوئی باتوں کو اپنے دل و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں جگہ دیں، ان کو محفوظ رکھیں، دوسروں کو بتائیں اور خود اُن پر عمل کریں، اُن کی علمی تشنگی کو بجھانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد نبوی کے متصل چبوترہ بنا کر ایک مدرسہ قائم کر دیا تھا جس کے طالب علم اصحابِ صُفّہ (چبوترے والے) کہلاتے تھے، ان کے کھانے پینے اور رہنے سہنے کا انتظام خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مدینے کے خوش حال لوگ کیا کرتے تھے، یہ لوگ معاشی فکروں سے الگ ہو کر دن رات قرآن سکھاتے، اور ذاتِ گرامی کے، جو کہ قرآن کی زندہ تفسیر تھی، اقوال بغور سنتے، افعال بغور دیکھتے اور دوسروں تک پہنچا دیا کرتے تھے، اس مدرسے کے بہت سے شاگردوں میں سے صرف ایک شاگرد ابوہریرہؓ نے پانچ ہزار تین سو چوہتر (۵۳۷۴) حدیثوں کی روایت کی ہے، اور یہی ابوہریرہؓ اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے۔

"تم کہتے ہوگے کہ ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت زیادہ حدیثیں بیان کیا کرتا ہے، خدا کی قسم میں ایک غریب و مسکین شخص تھا، اور پیٹ کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتا تھا، مہاجرین بازاروں کے کاروبار میں مشغول رہتے اور انصار اپنے اموال (باغوں اور کھیتوں) میں اُلجھے رہتے تھے۔"

دوسری جگہ حضرت ابوہریرہؓ نے بیان کیا ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

ربط ہے۔

فقہ کے بہت سے احکام کو آئمہ مجتہدین نے قرآن کریم کے کلیات اور سنتِ نبوی سے سمجھ کر نکالا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کی آیت وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج) (اللہ نے دین میں تمھارے اوپر دشواری نہیں کی ہے) پیش کی جاتی ہے۔ اس آیت سے آئمہ مجتہدین نے ایک قانون بنا لیا، یعنی اَلْمُشَقَّةُ تَجْلِبُ التَّيْسِيْرَ (جس کا حاصل یہ ہے کہ سختی کے وقت آسانی کی جائے گی) اب جب کبھی ضرورت پڑے گی اس قانون سے کام لے کر آسانی کی کوئی صورت نکالی جائے گی۔ تیمم کے مسائل، بیماری کی حالت میں عبادات کے مسائل، سفر کی حالت میں عبادت میں رعایت کے مسائل، مثلاً یہ کہ مسافر قصر کرے یعنی چار رکعت فرض کی بجائے دو رکعت پڑھے، وہ جماعت ترک کر سکتا ہے اور سفر کی حالت میں روزہ چھوڑ سکتا ہے۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں جن میں حالات کے لحاظ سے اسلام نے نرمی اور رعایت کر دی ہے۔

علمِ فقہ کی حقیقت

فقہ قرآن اور حدیث کے احکام کا مجموعہ ہے، جن کو آئمہ مجتہدین نے اس لئے مرتب کیا کہ لوگوں کو مسائل معلوم کرنے میں آسانی ہو، یہ قرآن و حدیث کے مخالف کوئی علم نہیں ہے، قرآن و حدیث کے احکام کو ایک خاص ترتیب دینے سے یہ علم بن گیا ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "تذکرہ اعظم" صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۸ (تالیف مولوی مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی)

ان پر عمل بھی کرتے چلے آئے ہیں حقیقت اور صداقت کا کس قدر قیمتی ذخیرہ بن جائیں گی! مولانا گیلانی نے سنت نبوی اور احادیث کے قابل اعتماد ہونے پر ذیل کے الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

" اگر صحابہ کی جو تعداد اوپر بیان کی گئی ہے (ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا اور روایت کی) صحیح ہے تو ایمان و اسلام اور جوشِ عمل کی ان میں جو سینہ زوریاں تھیں اُن کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا یقیناً مبالغہ نہ ہوگا کہ عہد نبوت میں بھی ہماری وہ تاریخ جس کا نام حدیث ہے، اس کے کامل و ناقص زندہ نسخوں اور اڈیشنوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی، کیا دنیا میں کوئی تاریخ یا کسی تاریخ کا کوئی حصّہ ایسا موجود ہے جس کے عینی شاہد اتنی تعداد میں خود اس واقعہ کے مجسّم آئینے بن کر دنیا کے سامنے پیش ہوئے ہوں ؟ اور کیا آئندہ ان نسخوں کی تعداد میں کوئی کمی ہوئی؟ کاملیت کے اعتبار سے جتنی بھی کمی ہوئی ہو، لیکن کمیّت اور تعداد میں اضعافاً مضاعفۃً اضافہ ہی ہوتا رہا اور ہو رہا ہے، ہر مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصّے میں آباد ہو، آج اس کی زندگی میں جتنے صحیح مذہبی اور اخلاقی عناصر شریک ہیں، کیا یہ اُسی تاریخ کے کسی حصّہ کا عکس نہیں ہے؟ آج بھی جو مسلمان ہندوستان کے کسی کوردہ دیہات میں جو نمازیں پڑھتا ہے قسم کھا کر کہہ سکتا ہے، اور یقیناً وہ اپنی اس قسم میں سچّا ہے کہ وہ اسی طرح ہاتھ اُٹھاتا ہے جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھاتے تھے، وہی کہتا ہے جو حضور کہتے تھے، وہی پڑھتا ہے جو حضور پڑھتے تھے، اسی طرح وہ جھکتا ہے جس طرح حضور جھکتے تھے، اسی طرح زمین پر سر رکھتا ہے،

خدمت کرتا تھا۔

اصحابِ صُفّہ کی تعداد اکائیوں سے گزر کر دہائیوں تک پہنچی ہوئی تھی، اصحابِ سِیَر نے لکھا ہے کہ وہ چبوترہ اتنا بڑا تھا کہ اس پر تین سو آدمی آسکتے تھے، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے اقوال و افعال دوسروں تک پہنچانے میں ان لوگوں نے کس قدر نمایاں خدمات انجام دی ہوں گی، اور پھر یہ سلسلہ یہیں تک ختم نہیں ہوتا، ہر سننے والا ضروری سمجھتا تھا کہ جو بات اُس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، وہ دوسروں تک پہنچا دے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے والوں میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتوں کی بھی ایک خاصی تعداد شریک ہے، جن کی وجہ سے آپ کی گھریلو زندگی کے حالات اور نقش و نگار بھی دنیا کے سامنے آگئے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کی یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ جس کا اعتراف باسورتھ اسمتھ (Basworth Smith) نے بہت صاف الفاظ میں اپنے ایک لیکچر میں اس طرح کیا ہے۔

"یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے، اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے[1]۔"

روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ ایک واقعے کو جب بہت سے لوگ بیان کرتے ہیں تو وہ زیادہ قابلِ اعتبار ہو جاتا ہے، اور تھوڑا بہت طرزِ ادا کا اختلاف نفسِ واقعہ کے صحیح ہونے پر کوئی نمایاں اثر نہیں ڈالتا، اس لحاظ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ احادیث جن کی عہدِ صحابہ سے اس وقت تک لوگ صرف روایت نہیں بلکہ

---

[1] خطباتِ مدراس صفحہ ۲۶

اسماء الرّجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم ہوسکتا ہو[1]۔"

یہ وہ ڈاکٹر اسپرنگر ہیں جن کی کتاب "لائف آف محمدؐ" کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے ہے کہ انھوں نے یہ کتاب مخالفانہ لکھی ہے۔

اسی فن رجال کے بارے میں محمدؐ مارماڈیوک پکتھال نے اپنے ایک لیکچر میں کہا ہے۔

"اس میں پیغمبر کے اقوال و افعال پوری احتیاط سے جانچنے اور پرکھنے کے بعد صرف مستند چیزوں کو تسلیم کیا جاتا ہے، اور بعد میں آنے والے ماہرین فن اگلے لوگوں کے کام پر نظرثانی کرتے، ہر حدیث کی سند دیکھتے، اور اگر اس میں کوئی کمزوری پاتے ہیں تو اس روایت کو کمزور کہہ دیتے ہیں[2]۔"

صحابۂ کرامؓ اور کتابتِ حدیث

احادیث رسولؐ کو زبانی یاد کرنے اور دوسروں تک پہنچانے کا صحابۂ کرام جس قدر اہتمام کرتے تھے اس کا ذکر تفصیل سے اوپر گذر چکا ہے، اور یہ بھی تاریخ کے حوالے سے لکھا جاچکا ہے کہ شروع زمانہ اسلام میں صحابۂ کرام میں بہت سے لوگ پڑھے لکھے تھے۔

عربوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی قوتِ یادداشت بہت قوی تھی، اور اتنی قوی تھی کہ آج اگر ان کے حافظہ اور یادداشت کے متعلق ایسے واقعات

---

[1] خطباتِ مدراس صفحہ ۳۰م (مولانا سید سلیمان ندوی) [2] دی کلچرل سائڈ آف اسلام صفحہ ۸۱

جس طرح حضور رکھتے تھے۔ اسی پر مسلمانوں کے دوسرے مذہبی اور دینی اعمال و عقائد کو قیاس کریجئے، کچھ نہیں تو کم از کم اس تاریخ کی کوئی ایک آدھ بات کلمۂ شہادت ہی سہی، اس تاریخ کا یہ جز تو ہر ایک مسلمان کے اندر اب تک محفوظ ہے۔[1]

روحانیت سے بیزار اور مادی دنیا کے شیدائی یہ بات سن کر ضرور ہنسیں گے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ میں بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں کہ جنھوں نے حدیث کے ایک لفظ کی تصحیح کے لئے سینکڑوں میل کا سفر کیا ہے، حضرت ابوایوب انصاریؓ کو ایک حدیث میں شک ہوا، اور جب اُن کو یہ خیال آیا کہ اس حدیث کے سننے وقت اُن کے ساتھ عقبہ بن عامرؓ صحابی بھی دربارِ رسالت میں موجود تھے، اور اب وہ مصر میں ہیں تو اُنھوں نے مصر کا سفر حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مل کر شک مٹانے کے لئے کیا، ابوسعید خدریؓ، سعید بن المسیبؒ اور مشہور تابعی مسروقؒ کے بھی اسی قسم کے واقعات رجال کی کتابوں میں موجود ہیں۔

آخر لوگ سینکڑوں اور ہزاروں برس پرانے تاریخی واقعات پر تو ایمان رکھتے ہی ہیں، اگر وہ حدیث اور اس کے راویوں کے حالات کو بھی تاریخ سمجھ کر اُن کو سچا سمجھیں تو اس میں اُن کا کیا نقصان ہے؟ خصوصاً جب کہ حدیث کے راویوں کے جانچنے اور پرکھنے کا فن جس کو کہ فن رجال کہا جاتا ہے، کے عظیم الشان ہونے کا اعتراف بہت سے مستشرقین نے کیا ہے، جن میں سے مشہور جرمن ڈاکٹر اسپرنگر کے الفاظ یہ ہیں۔

"نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح

---

[1] تدوین حدیث صفحہ ۸۹

کافی مدت تک حضرت ابوہریرہؓ کی خدمت میں رہے اور ان کی حدیثوں کو جمع کیا، جو صحیفۂ ہمام کے نام سے مشہور ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جس کام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو، صحابہ کرامؓ اس کے کرنے سے کیوں ہچکچاتے، ابوداؤد میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مشہور خطبہ جو آپ نے فتح مکہ کے دن ارشاد فرمایا تھا، اس کو سن کر ایک صحابی ابوشاہؓ نے عرض کیا کہ میرے لئے لکھوا دیجئے، آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا کہ وہ خطبہ ان کو لکھ کر دے دیا جائے، خطبہ لکھ کر ان کے حوالے کر دیا گیا۔

"حضرت وائل ابن حجر، حضر موت کے شہزادوں میں سے تھے، مدینہ منورہ حاضر ہو کر مسلمان ہوئے، اور کچھ دنوں خدمتِ اقدس میں حاضر رہے، جب گھر واپس جانے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے سپرد کیا، جس میں نماز، شراب، سود وغیرہ کے احکام تھے[1]"

سیرتِ نبوی پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان خطوط، معاہدوں، اور صلح ناموں وغیرہ کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھوا کر، بادشاہوں اور قبائل کے سرداروں کو بھیجے یا مختلف لوگوں کے حوالے کئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے باقاعدہ تدوین حدیث کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے اپنے زمانۂ خلافت ۹۹ - ۱۰۲ھ میں اشاعتِ سنت کی تحریک عام کرنے

---

[1] کتابتِ حدیث صفحہ ۲۲ (طبرانی صغیر کے حوالے سے)

پیش کئے جائیں جو مستند کتابوں میں موجود ہیں تو خراب صحت اور کمزور حافظہ رکھنے والے لوگ اُن کو افسانہ خیال کریں گے۔ بہت ممکن ہے کہ قوّت حافظہ پر غیر معمولی اعتماد نے اُن کو لکھنا پڑھنا سیکھنے کی طرف زیادہ مائل نہ ہونے دیا ہو، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ صحابہ کرامؓ میں کچھ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات لکھ لیا کرتے تھے، ابوہریرہؓ، عبداللہ بن عمروؓ اور حضرت انسؓ ان صحابہؓ میں سے ہیں جن کے پاس خود اُن کی لکھی ہوئی کافی تعداد میں حدیثیں موجود تھیں، حضرت انسؓ نے تو اپنے بچّوں کو بھی احادیث نبوی لکھنے کی وصیّت کرتے ہوئے فرمایا یَا بَنِیَّ قَیِّدُوْا هٰذَا الْعِلْمَ" (اے میرے بچّو اس علم کو لکھ لو۔)

ان ہی حضرت انسؓ سے روایت کرنے والوں میں سے حضرت معبد بن ہلال کا بیان ہے کہ جب احادیث کے متعلق ہم لوگ حضرت انسؓ سے زیادہ پوچھ گچھ کرتے تو حضرت انسؓ ایک چونگا نکال لاتے اور فرماتے یہ وہ احادیث ہیں جنھیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُن کر لکھ لیا ہے اور لکھ کر ان احادیث کو دربار رسالت میں پیش کیا ہے، اور اس کی تصدیق و توثیق کرالی ہے[1]۔"

اس واقعے سے اتنا تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم حضرت انسؓ کی مرویات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق و توثیق حاصل ہے، حضرت عبداللہ بن عمروؓ جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، کے پاس بہت سی لکھی ہوئی حدیثیں کتاب کی شکل میں موجود تھیں جس کا تذکرہ وہ "صحیفۂ صادقہ" کے نام سے لوگوں کے سامنے کیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے ایک شاگرد ہمام بن منبّہ ہیں، جو یمن کے رئیسوں میں سے تھے،

---

[1] کتابت حدیث صفحہ ۲۶ (تالیف مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی)

دریافت فرمایا کہ تم لوگ کیا لکھ رہے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ جو کچھ آپ سے سنتے ہیں لکھ لیتے ہیں، اُس میں قرآن و حدیث کا کوئی امتیاز نہ تھا، بھلا آپ کی دوربین نگاہ اس بات کو کب پسند کر سکتی تھی کہ صحابہؓ کوئی ایسا کام کریں کہ جس کی وجہ سے مخالفین اسلام کو چہ میگوئیوں کا موقع ملے، یا آنے والے لوگوں کو احکام خداوندی اور تعلیمات نبوی میں خلط ملط کا شبہ پیدا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ سوال وجواب ان لوگوں سے نہ تھا کہ جو دربار نبوی میں وحی لکھنے کے لئے مخصوص تھے۔ کیونکہ وہ لوگ تو آپ کے سامنے بیٹھ کر قرآن کریم کی آیات لکھتے اور آپ ان سے دوبارہ پوچھتے کہ تم نے کیا لکھا ہے، اور اگر کوئی چیز لکھنے سے رہ جاتی تو آپ تصحیح کرا دیتے، پھر اُن لوگوں سے یہ سوال کیسے کیا جا سکتا ہے کہ تم لوگ کیا لکھ رہے ہو؟ جب ایک ساتھ دونوں چیزیں لکھی جائیں گی تو ان میں یہ امتیاز کرنا کہ یہ حصہ قرآن کا ہے اور یہ حدیث کا، یقیناً مشکل ہو جائے گا، لکھنے والے صحابہ کرام نے جب عرض کیا کہ جو کچھ بھی آپ سے سنتے ہیں وہ لکھ لیتے ہیں، تو آپ نے تعجب سے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ ایک اور کتاب لکھی جا رہی ہے، یعنی قرآن کے ساتھ میری کہی ہوئی باتوں کو اس طرح لکھنا کہ دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہ رہنے کا اندیشہ ہو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا اللہ کی کتاب کو علاحدہ کرو۔

اس حدیث کے راوی جس میں کہ یہ پورا واقعہ ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آپ کے اس حکم کے بعد ہم نے جو کچھ بھی قرآن و حدیث ملا کر لکھا تھا، اپنے ساتھیوں کے پاس سے جمع کیا اور جلا دیا۔ یہ مطلب ہے اس حدیث کا

کی کوشش کی، اور ابوبکر بن حزمؒ مدینہ طیبہ کے گورنر کو لکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو نہایت احتیاط سے لکھنے کا اہتمام کرو۔ حدیث نبوی کے علاوہ کسی اور کا قول نہ لیا جائے، علماء کو چاہیئے کہ وہ ناواقف لوگوں کو بتا کر اس علم کی اشاعت کریں، کیونکہ علم اگر راز ہو جائے (یعنی صرف چیدہ چیدہ لوگ اس سے واقف ہوں) تو اس کی فنا یقینی ہے۔ اسی طرح آپ نے مملکتِ اسلامیہ کے دوسرے شہروں کے حکام کی توجہ حدیث کی باقاعدہ تدوین کی طرف مبذول کی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے اس حکم پر سب سے پہلے امام محمد بن مسلم الزہریؒ نے لبیک کہا اسی لئے امام زہری کو تدوین حدیث کا سنگِ بنیاد کہا جاتا ہے۔

بات تشنہ رہ جائے گی اگر اس حدیث کا ذکر نہ کیا جائے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابتِ حدیث سے روکا اور فرمایا کہ جس نے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا ہو تو وہ اس کو مٹا دے۔

بظاہر یہ حدیث ان حدیثوں کے خلاف معلوم ہوتی ہے کہ جن میں حدیثوں کے لکھنے کی اجازت یا حکم دیا گیا ہے، لیکن اگر حقیقت پر غور کیا جائے تو تعارض باقی نہیں رہتا، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم حالات اور ضرورت کے مطابق تھوڑا تھوڑا نازل ہو رہا تھا، آج چند آیتیں نازل ہو گئیں تو کل کوئی پوری سورۃ نازل ہو گئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص وحی کے لکھنے والے صحابہ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو بتایا کرتے تھے کہ یہ سورۃ یا یہ یہ آیتیں نازل ہوئی ہیں، یا کسی صحابی کی کسی بات کا جواب اگر وحی میں ہوتا تو آپ اُن کو بھی بلا کر فرما دیتے کہ یہ نازل ہوا ہے، آپ نے ایک مرتبہ چند صحابہ کو ایک کاغذ پر کچھ لکھتے دیکھ کر

اسلامی رواداری

مذہب کو ذاتی یا نجی معاملہ کہنے کا مقصد اگر یہ ہے کہ کسی کے مذہبی معاملات میں مداخلت کر کے اس کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے، تو اس کو اسلام بھی تسلیم کرتا ہے، لیکن مذہب کے ذاتی معاملہ ہونے کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ وہ چند ایسے عقاید و عبادات کا نام ہے جن کا تمام تر تعلق بندہ اور خدا سے ہے تو اسلام کے نزدیک مذہب کا یہ تصوّر قابل قبول نہیں، اسلام جس کے دینی احکام اور تعلیمات نے انسان کی انفرادی، اجتماعی، ثقافتی، تمدّنی، اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور معاشی، غرض پوری دنیوی زندگی کو گھیر لیا ہے، وہ کیوں کر کسی شخص کا ذاتی معاملہ ہو سکتا ہے، دنیوی معاملات سے بالکل الگ تھلگ رہنے والا شخص اسلام کی صحیح نمایندگی نہیں کرسکتا۔

اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اخلاق، معاشرت اور معاملات کی اہمیت

جس میں کہ آپ نے قرآن کریم کے علاوہ کسی اور چیز کے لکھنے سے منع فرمایا تھا۔
انصاف پسند لوگ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ بالکل معلوم نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیثوں کے لکھنے سے روک دیا تھا اور پھر کسی صحابی کو اس کے بعد حدیث لکھنے کی جرأت نہ ہوئی ہوگی، حدیث کے الفاظ صاف طور سے بتاتے ہیں کہ اس میں کتابت کے اس طریقے سے روکا گیا ہے جس سے قرآن و حدیث کا باہمی فرق و امتیاز باقی نہ رہتا ہو، ورنہ حدیثیں تو آپ نے خود لکھوائی ہیں، جیسا کہ مفصّل گزر چکا ہے۔

میں مسلمانوں نے صحیح اسلامی زندگی کی پابندی کی ہے، قومیں ان کے عملی نمونوں سے متأثر ہوکر اسلام کی طرف جھکی ہیں اور جب کبھی مسلمان اسلامی تعلیمات سے بے تعلق ہوئے ہیں تو قوموں کے دل اُن سے ٹوٹتے چلے گئے ہیں، اور وہ اسلام سے بھاگنے لگی ہیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عملی زندگی اسلام میں بہت اہمیت رکھتی ہے، پھر جن لوگوں کا عمل ان کے علمی نظریات کا مذاق اُڑا رہا ہو، وہ محض خوبصورت تعبیروں، اچھی تقریروں اور مرصّع تحریروں سے عملی زندگی کے اس نظام کو کس طرح دوسرے انسانوں تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جوکہ انسانوں کا دین بننے کے لئے آیا تھا "رواداری" کو ضروری سمجھتے ہوئے اس کے لئے مستقل قوانین بنا دیئے، صرف احادیث رسولؐ نہیں بلکہ قرآن کریم کے ایک بڑے حصّے میں اخلاق، معاملات و معاشرت کو بہتر بنانے پر زور دیا گیا ہے

رواداری کی تعریف

لفظ "رواداری" کا شمار ان الفاظ میں ہے کہ جو بولے تو بہت جاتے ہیں لیکن ان کے صحیح مفہوم سے کم لوگ واقف ہوتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ اس کی تشریح کردی جائے۔

دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آنا، کوئی ایسی بات نہ کہنا اور ایسا کام نہ کرنا کہ جس سے ان کا دل دکھے، مذہبی معاملات میں ان کو آزادیٔ ضمیر کا حق دینا، اُن کو اپنا ہی جیسا انسان اور خدا کی مخلوق سمجھ کر دُکھ درد اور مصیبت میں اُن کی مدد کرنا، اُن سے اپنے دل میں کسی قسم کا کینہ و بغض نہ رکھنا، اور ان پر کسی حالت

عقائد و عبادات سے کچھ زیادہ ہی نظر آئے گی، اور ان میں بھی معاشرت یعنی آپس کے رہن سہن اور سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لئے جو اسلامی تعلیمات ہیں وہ اس لیے اہم ترین سمجھی جائیں گی کہ ان میں مذہب و ملّت، رشتہ و قرابت، ذات پات، دوستی و محبّت وغیرہ کے تمام تعلّقات سے قطع نظر کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ کیسے پیش آئے، اور اسی کا نام انسانیت ہے، اسلام کے نزدیک انسانیت کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان تو انسان، کسی جانور کو بھی بلا وجہ تکلیف نہ پہنچانا چاہیئے۔ راستے سے کانٹوں یا کسی ایسی چیز کا ہٹا دینا کہ جس سے چلنے والوں کو تکلیف ہوتی ہو، اسلام نے اس کو بڑا نیک کام اور ایمان کا لازمہ قرار دیا ہے، کسی دوسرے انسان کا دل خوش کرنے کے لئے کوئی سچّی اور اچھی بات کہہ دینے کا ثواب مالی صدقہ اور خیرات کے برابر بتایا ہے۔ اس قسم کی اسلامی تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ معاشرہ یا سماج کو بہتر بنا کر ایک انسان کو دوسرے انسان سے فائدہ اُٹھانے کا پورا پورا موقع دیا جائے، اور یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جن دو انسانوں میں دلی رنجش اور نفرت ہوگی وہ ایک دوسرے سے کسی قسم کا فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ اختلاف مذہب کی صورت میں دشمنی اور نفرت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ ایک مذہب کا ماننے والا دوسرے مذہب کے ماننے والے کو انسانیت کی فہرست ہی سے خارج کر دیتا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ دوسری قوموں کے اسلام کی طرف مائل ہونے یا اس سے نفرت کرنے میں زیادہ تر دخل مسلمانوں کے طرزِ عمل ہی کو رہا ہے جس زمانے میں اور جس علاقے

کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا برتاؤ غیروں کے ساتھ کیسا تھا، اور وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو کس وجہ سے ذلیل سمجھتے تھے، اور جب بہت سی تہذیبوں کا تفصیلی ذکر کیا جاتا تو یہ بات انصاف کے خلاف ہوتی کہ روما کی حریف ایرانی تہذیب کو بالکل ہی بھلا دیا جاتا، اور خاص طور سے نوشیرواں عادل کو کہ جس کے متعلق بہت افسوس کے ساتھ یہ بات لکھنا پڑتی ہے کہ اس کی سلطنت میں بھی اعلیٰ اقوام کا برتاؤ پست اقوام کے ساتھ روادارانہ نہیں تھا، لکھنے والوں نے "نوشیرواں نامہ" کے حوالے سے لکھا ہے، کہ ایک موقع پر نوشیرواں کو روپے کی ضرورت پڑی تو ایک موچی نے چالیس لاکھ درم بادشاہ کو اس شرط پر قرض دینا منظور کئے کہ اس کے بیٹے کو جو پڑھا لکھا اور شائستہ ہے بادشاہ کوئی اچھا عہدہ عطا فرمادے، لیکن نوشیروان عادل نے ناراض ہو کر روپیہ لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا "جب موچیوں کے لڑکے سلطنت کے عہدے دار ہوں گے تو کیا شرفاء اور معززین کی اولاد ان کی جوتیاں سیدھی کیا کرے گی، مجھے یہ بات ہرگز پسند نہیں کہ موچی کا لڑکا ایک خاندانی معزز آدمی کے برابر بیٹھے"۔ اس طوالت سے بچنے کے لئے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اشارات پر اکتفا کر کے اصل موضوع کی طرف رجوع کیا جائے۔

دنیا کا کوئی مذہب تیزی سے پھیلنے میں اسلام کا مقابلہ نہ کرسکا

دنیا کی تاریخ نے آج تک کوئی ایسا مذہب پیش نہیں کیا جو اتنی تھوڑی مدت میں

---

[1] ملاحظہ ہو تفصیل کے لئے اسپینش اسلام صفحہ ۲۱۵ تا ۲۱۸ (مطبوعہ لندن ۱۹۱۳ء)

Spanish Islam By Dozy P. 215-218

میں ظلم و زیادتی روا نہ رکھنا۔ یہ ہے وہ "رواداری" کہ جس کا مطالبہ اسلام نے اپنے ماننے والوں سے کیا ہے، اور جس پر ہر مہذب انسان کو اپنی عقلِ سلیم کی روشنی میں کاربند ہونا چاہیئے۔

اس موقعے پر یہ نہیں بتانا ہے کہ اسلام سے پہلے رواداری کے لحاظ سے متمدن اقوام کی کیا حالت تھی، اس کے لئے یہ صفحات ناکافی ہوں گے، کیونکہ تفصیل سے یہ بتانا پڑے گا کہ ہندوستان کے قدیم باشندوں کے ساتھ آریہ فاتحین نے اپنی مذہبی تعلیمات کے پیشِ نظر کس قسم کا برتاؤ کیا، یہ بھی ظاہر کرنا ہوگا کہ غریب و بیکس انسانوں کے لئے منوسمرتی کے کیا قوانین تھے، اور ہندوستان سے باہر روما کی اس مشہور تہذیب کے متعلق بھی کچھ نہ کچھ کہنا ہی ہوگا کہ جس میں عیسائی رعایا بھی زمین کے ساتھ فروخت ہو جایا کرتی تھی، اور زمین کا خریدار زمین کے ساتھ ساتھ اس کے کاشتکاروں کا بھی مالک ہو جاتا تھا، اور اُس تاریخی حقیقت کو کیسے چھپایا جا سکے گا کہ قدیم اسپین میں قیصر اپنے آپ کو سلطنت کی کُل زمینوں کا مالک سمجھتا تھا، اور رعایا کے بارے میں اُس کا یہ خیال تھا کہ زمین پر وہ کسی قسم کے مالکانہ حقوق نہیں رکھتی، قیصر کی حکومت میں ایک ایک امیر کے حضور میں آٹھ آٹھ ہزار غلام خدمت کے لئے رہتے تھے، جن کی خرید و فروخت جانوروں اور خانگی سامان کی طرح ہوتی تھی، اور مشہور مورخ ڈوزی (Dozy) کے اُس حوالے کو بھی نقل کرنا پڑے گا جس میں انھوں نے لکھا ہے "غلاموں پر سختیاں بڑی بے رحمی سے کی جاتی تھیں، بعض اوقات آقا اپنے غلام کو تین سو کوڑے صرف اس جرم پر لگاتا کہ وہ مانگتے ہی گرم پانی کیوں نہیں لایا، اور اس کو کیوں انتظار کرنا پڑا[1]" پھر یہ بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ یہ بھی دیکھنا ہوگا

[1] نوٹ صفحہ ۳۳۳ پر دیکھیے۔

لوگوں نے جان تک دینے سے دریغ نہ کیا، اور اگر کسی نے جبراً وقہراً مذہب کو بظاہر چھوڑا بھی تو پہلا موقع ملنے پر پھر اس کی طرف رجوع کیا، اس سے بخوبی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا۔

اسلامی سیاست کو سراہتے ہوئے اور اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، پروفیسر محمد مجیب رقم طراز ہیں۔

" اسلام کے پیدا کئے ہوئے حوصلے دل میں رکھ کر عرب اپنے گھروں میں بیٹھے نہیں رہ سکتے تھے۔ اُن کا دنیا میں پھیلنا لازمی تھا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایسی تیزی سے مغربی ایشیا، مصر اور پھر روم پر چھا گئے کہ جس کا تاریخ میں جواب نہیں۔ یہ کرشمہ ان کی تلوار نے نہ دکھایا اور نہ دکھا سکتی تھی۔ اُن کی فوجیں اتنی چھوٹی تھیں، اُن کے پاس سرمایہ اور سامان اتنا کم تھا کہ اگر وہ اسی پر بھروسہ کرتے تو اس وقت کی سلطنتیں انھیں انگلیوں میں مسل ڈالتیں۔ لیکن اسلام نے انھیں سیاست کے جوگُر بتائے تھے انھوں نے ہر مشکل آسان کر دی۔ قلعوں کے دروازے کھول دئے۔ شہروں کی فصیلیں گرادیں، دشمنوں کی ہمتیں ہٹادیں، اور مسلمانوں کے سائے کو یہ صفت بخشی کہ جہاں پڑے وہاں ویرانے کو بستی اور جنگل کو کھیت بنا دے۔"[1]

پروفیسر آرنلڈ (Arnold) نے اپنی کتاب پریچنگ آف اسلام (Preaching of Islam) میں مذہب اسلام کے جلد ترقی کرنے کی ایک وجہ یہ بتائی ہے کہ عیسائیوں کے مختلف فرقوں میں آپس میں بہت زیادہ اختلافات تھے، وہ ایک دوسرے سے سخت نفرت کرتے تھے، اور ایک فرقہ

---

[1] دنیا کی کہانی صفحہ ۱۲۵ - ۱۲۶

اسلام کے برابر پھیل گیا ہو، اس حقیقت کا اعتراف مخالفین اسلام نے بھی کیا ہے، یہ اور بات ہے کہ ان میں سے اکثر نے یہ کہا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ سچ تو ظاہر ہو کر رہتا ہے، آخر کار رلائل کو ان متعصب عیسائیوں سے یہ کہنا پڑا۔

"جس قسم کا الزام تم اسلام کو دیتے ہو اس سے تو خود عیسائیت کا دامن بھی پاک نہیں ہے، پیغمبر اسلام کے دین کی کامیابی کا راز اس کا روادارانہ سلوک ہے[1]"

پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں" اسلام کے جلد پھیل جانے کی وجہ مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیاں ہیں نہ کہ تلوار[2]"

اگر عقل پر تھوڑا سا زور دیا جائے تو سمجھ میں آجائے گا کہ عقائد ایسی چیز نہیں ہیں کہ جن کو تلوار کے زور سے پھیلایا جا سکتا ہو، آج اگر دنیا کی کوئی طاقتور سے طاقتور حکومت یہ چاہے کہ تلوار کے زور سے کسی مذہب کو پھیلائے، یا اس کو پھیلنے سے روک دے اور ان عقائد و خیالات کو جو لوگوں کے دل و دماغ کی انتہائی گہرائیوں میں جگہ پکڑ چکے ہیں تلوار کے زور یا تشدد سے باہر نکال دے، تو یہ قطعاً ناممکن ہے، اس لئے کہ عقیدہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جو تلوار کے ذریعہ سے دل و دماغ میں بٹھایا جا سکے، یا تلوار کے زور سے اس کو دلوں سے نکالا جا سکے، سینکڑوں واقعات اس قسم کے دیکھنے میں آتے رہتے ہیں کہ مذہب کی خاطر

---

[1] اون دی ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ صفحہ ۸۰-۸۱ On the Heroes and Hero-worship (Carlyle) P. 80-81.

[2] دی پریچنگ آف اسلام صفحہ ۴ The Preaching of Islam P. 4

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے اس قدر جلد ترقی کرنے کے کیا اسباب تھے؟ مؤرخین اور اصحاب سیر نے اسلام کی ترقی کے جن تفصیلی اسباب کو بیان کیا ہے اُن کے ذکر کا تو یہاں موقع نہیں، لیکن اس حقیقت کا سب اعتراف کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا اچھا برتاؤ، یا دوسرے الفاظ میں "اسلامی رواداری" دین اسلام کی ترقی کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب ہے شیخ محمد عبدہٗ لکھتے ہیں۔

"غیر مسلم حکمراں لڑائیوں میں اپنے مذہبی پیشواؤں اور مبلّغین کی ایک جماعت ساتھ رکھتے تھے۔ اور جب کوئی ملک فتح کر لیتے تو ان مبلّغین کو بھیجتے تاکہ وہ شکست خوردہ لشکر میں جاکر اپنی چرب زبانی یا دوسری تدابیر سے لوگوں کو اپنے مذہب کی طرف لائیں، لیکن اسلامی جنگوں میں ہمیں اس قسم کے واقعات کی کوئی نظیر نہیں ملتی، بلکہ مسلمان حُسنِ معاملت اور اچھے برتاؤ سے دشمنوں کے دل جیتنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔"[1]

فتح مکّہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے عیسائی مؤرخ فلپ ہٹّی نے لکھا ہے۔

"لوگوں کے ساتھ بڑا اعالی ظرفانہ اور رواداری برتاؤ کیا گیا۔ تاریخ میں ایسے فاتحانہ داخلے کی ہم کو مشکل ہی سے کوئی نظیر مل سکے گی۔"[2]

فتح مکّہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمنوں کے ساتھ اچھا برتاؤ دکھاتے ہوئے سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"آج یہ سب مجرم سرنگوں سامنے تھے، پیچھے دس ہزار خون آشام تلواریں

---

[1] رسالۃ التوحید صفحہ ۱۸۳ - ۱۸۴ —

[2] دی عربس صفحہ ۲۸ The Arabs (Philip K. Hitti) P. 28

دوسرے فرقے کے درپۓ آزار رہتا تھا، اس لئے بہت سے لوگ اس بے جا ظلم و تشدد سے اُکتا کر عقیدۂ وحدانیت کی طرف مائل ہوگئے۔[1]

مکی زندگی کے بارہ تیرہ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قسم کی مصیبتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے گزارے اُن کی تفصیل سیرت کی کتابوں میں موجود ہے، اور اس پوری مدت میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ تعداد کے اعتبار سے زیادہ نہ تھے، ہجرت کے بعد مدینے میں، اسلام کو پھولنے پھلنے کا موقع ملا، اور سرکار دوعالم کی زندگی ہی میں اسلام کا نور شام اور بحرین تک پہنچ گیا، آپ کے بعد خلفاء راشدین کے زمانے میں اسلام کی حدود ایران اور شام سے آگے بڑھ کر مختلف سمتوں میں سندھ اور روس تک جا پہنچیں، مصر، طرابلس اور افریقہ کے صحراؤں میں اذانوں کی صدا گونجنے لگی، بنو اُمیّہ کے دورِ خلافت میں اسلام کی نورانی شعاعیں ترکستان اور ہند کے کچھ حصّے سے گزر کر شرق میں چین کی سرحد تک اور غرب میں اس قدر پھیلیں کہ اندلس اُن کے نور سے جگمگا اُٹھا، اور وہاں اسلامی پرچم لہرانے لگا۔

دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں
کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں (اقبالؔ)

مفتی محمد عبدہ نے "رسالتہ التوحید" میں لکھا ہے۔

"جس رفتار سے اسلام پھیلا ہے تاریخ نہیں بتاتی کہ دنیا کا کوئی دوسرا مذہب اس رفتار سے پھیلا ہو۔"[2]

---

[1] ضحی الاسلام صفحہ ۲۷۶ بحوالہ پریچنگ آف اسلام (سید احمد امین مصری) [2] رسالتہ التوحید صفحہ ۱۸۲

دی تو انگلستان کے بادشاہ رچرڈ کی شرمندگی اور ندامت نے، دوسرے اس کی کیا قدر کرتے، جب انھوں نے اپنے انھیں عیسائی بھائیوں کو جنھیں مسلمانوں کی رحمدلی نے ساحل تک پہنچا دیا تھا، کتوں کی طرح مار بھگایا، اور انھیں بھوکوں مرنے دیا۔۔۔ عیسائیوں کے مذہبی رہنماؤں نے بھی مسلمانوں کی شرافت اور ان کے ہر احسان کی یاد کو تعصب کی آگ میں جلا دیا، اور عیسائیوں کے خیال میں مسلمان بے دین اور سنگدل، وحشی اور ناپاک ہی رہے۔ مسلمانوں نے بہرحال اپنا فرض ادا کر دیا تھا وہ نقصان میں رہے، لیکن خدا کی خدمت اور دنیا پر احسان وہی کر سکتا ہے جو ایسے نقصان کو خوشی سے گوارا کرلے، اس لئے کہ آدمیت ایسے ہی نقصان پر پلتی ہے"[1]

علامہ شبلی نعمانی نے عربوں کی صلح پسندی اور بے تعصبی کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"اسپین میں مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ اور بھی زیادہ نرمی کا برتاؤ کیا، یہاں تک کہ اُن کی جو حالت قدیم جرمنیوں کی سلطنت کے زمانے میں تھی، اس سے کہیں بڑھ کر وہ خوش حال ہو گئے"[2]

پروفیسر ڈوزی کہتے ہیں کہ "مسلمانوں کی فتح نے اسپین کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا، ابتدائے فتح کے زمانے میں جو برہمی اور اضطراب پیدا ہو چکا تھا وہ استقلالِ سلطنت کے بعد جاتا رہا، مسلمانوں نے تمام باشندوں کے مذہب، شریعت اور عدالت کو قائم رکھا۔ ان کو ملکی عہدے دئے، یہاں تک کہ بعض

---

[1] دنیا کی کہانی صفحہ ۱۳۲-۱۳۳ [2] مقالاتِ شبلی جلد اوّل صفحہ ۱۴۸

محمد رسول اللہ کے ایک اشارے کی منتظر تھیں، دفعتہً زبانِ مبارک کھلتی ہے سوال ہوتا ہے، قریش! بتاؤ آج تمھارے ساتھ کیا سلوک کروں؟ جواب ملتا ہے "محمد تو ہمارا شریف بھائی اور شریف بھتیجا ہے" ارشاد ہوتا ہے، آج میں وہی کہتا ہوں جو یوسف نے اپنے ظالم بھائیوں سے کہا تھا کہ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ آج کے دن تم پر کوئی الزام نہیں، اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ جاؤ تم سب آزاد ہو"

یہ ہے دشمنوں کو پیار کرنا، اور معاف کرنا، یہ ہے اسلام کے پیغمبر کا عملی نمونہ، اور عملی تعلیم، جو صرف خوش بیانیوں اور اچھی اچھی نصیحتوں تک محدود نہیں بلکہ دنیا میں واقعہ اور عمل بن کر ظاہر ہوئی ہے[۱]"

بیت المقدس میں صلیبی فوجوں کے مظالم بیان کرنے کے بعد مسلمانوں کا عیسائیوں کے ساتھ رواداری سلوک بیان کرتے ہوئے پروفیسر محمد مجیب تحریر فرماتے ہیں۔

"لیکن جب سلطان صلاح الدین بیت المقدس پر قبضہ کرتا ہے تو نہتوں کیا سپاہیوں کو بھی امان دی جاتی ہے، بہن اور بھائی، شوہر اور بیوی، ماں اور بیٹے جو لڑائی کی ہلچل میں جدا ہو گئے ہیں، تلاش کر کے ایک دوسرے کے پاس پہنچائے جاتے ہیں، بہت سے لوگ جو معاہدے کے مطابق روپیہ دے کر اپنی آزادی خرید نہیں سکتے، ان کو یہ روپیہ معاف کر دیا جاتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہیں جن کی طرف سے صلاح الدین اور اس کے بھائی اپنی جیب سے یہ روپیہ ادا کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ ان کو سفر کا خرچ بھی دیتے ہیں۔ اس شرافت کی داد اگر کچھ

---

[۱] خطبات مدراس صفحہ ۱۴۱

بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ه (البقرۃ)	پیغمبروں کے ساتھ، کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے، اور ان سب نے یوں کہا کہ ہم نے سنا اور خوشی سے مانا، ہم آپ کی بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار، اور آپ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔ (بیان القرآن)

مسلمانوں کو قرآن کریم میں حکم دیا گیا ہے کہ اہل کتاب کے ساتھ اچھی طرح پیش آیا کرو، اور ان سے بات چیت میں ایسا ڈھنگ اختیار کیا کرو کہ وہ تم کو اپنے سے قریب سمجھنے لگیں، اور ان کی دل شکنی نہ کیا کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن میں اپنے ایک کارکن کو لکھوا کر بھیجا، "یہودیوں اور عیسائیوں کے دینی معاملات میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔"

"پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں: "عمر فاروقؓ نے سختی سے حکم دیا کہ جو لوگ اپنے پرانے مذہب پر باقی رہنا چاہیں اُن کو اسلام لانے پر مجبور نہ کیا جائے۔"[1]

ایک مرتبہ حضرت عمر بن الخطابؓ کی خدمت میں جزیہ کا بہت سا مال پیش کیا گیا، تو آپ نے فرمایا "میرا یہ خیال ہے کہ تم نے لوگوں پر بہت ظلم و زیادتی کرکے یہ مال وصول کیا ہے۔" وصول کرنے والوں نے قسم کھا کر کہا، ہم نے زبردستی کسی سے کچھ نہیں لیا ہے، آپ نے پھر دریافت فرمایا کہ تم نے مار پیٹ کر کچھ اور تو اُن سے نہیں لیا ہے، انھوں نے جواب دیا نہیں، اس کے

---

[1] پریچنگ آف اسلام صفحہ ۴۵ The Preaching of Islam (T. W. Arnold)

خود خلفاء کے دربار میں ملازم تھے، اکثروں کو فوجی عہدے دئے گئے، اس حسنِ سیاست نے اسپین کے عقلاء کو مسلمانوں کی طرف مائل کر دیا، یہاں تک کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں کثرت سے نکاح اور رشتہ داریاں ہو گئیں سینکڑوں عیسائی اپنے مذہب پر قائم رہنے کے ساتھ ساتھ عرب کی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے عربی زبان اور عربی علوم و فنون کی تحصیل شروع کی، بشپ اور پادری اُن کو ملامت کیا کرتے تھے کہ وہ گرجا کے گیت چھوڑتے جاتے اور مسلمانوں کا شعار اختیار کرتے جاتے ہیں[1]۔

اسلامی رواداری کی یہ کتنی کھلی ہوئی مثال ہے کہ اُس نے اپنے پیرؤں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰؑ، حضرت داؤدؑ، اور ان تمام انبیاء علیہم السلام پر جو اس روئے زمین پر آئے، ایمان لائیں، اور ان کو خدا کا سچا پیغمبر تسلیم کریں، ایک شخص صرف حضرت موسیٰ پر ایمان لا کر یہودی ہو سکتا ہے، دوسرا صرف حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لا کر عیسائی ہو سکتا ہے لیکن کوئی شخص اس وقت تک مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور دوسرے تمام پیغمبروں پر ایمان نہ لے آئے۔ قرآن کریم میں ہے۔

آمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِکَتِهٖ وَکُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ	اعتقاد رکھتے ہیں رسول اس چیز کا جو اُن کے پاس اُن کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور مومنین بھی، سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے

[1] مقالات شبلی جلد اوّل صفحہ ۱۴۸

ایک ایسا پردہ ڈال دیتا ہے جو اُس کو دوسروں کے معاملات میں انصاف پسندی سے روک دیتا ہے، ظاہر ہے کہ کوئی شخص اگر انصاف چھوڑ دے تو وہ سب کچھ کر سکتا اور کہہ سکتا ہے، دوسروں کی تکلیف کی اس کو کیا پروا ہو سکتی ہے، اور کون نہیں جانتا کہ بے انصافی کھلا ہوا ظلم ہے بعض عیسائی مصنفین نے یہ دکھانے کے لیے کہ اسلام میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا، جزیہ کی بحث پر بہت زیادہ زورِ قلم صرف کر دیا ہے، یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسلام ہی لفظ "الجـزیہ" کا موجد ہے، جس سے اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مسلموں میں غیر مناسب تفرقہ قائم کرنا تھا، اور جس نے آگے چل کر تعصب کی شکل اختیار کر لی۔ اعتراض کرنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ اس لیے مسلمان ہو جایا کرتے تھے کہ ان کو جزیہ نہ ادا کرنا پڑے، کیونکہ وہ اس کو باعث ذلت سمجھتے تھے۔

اس اعتراض کا منشا وہی مذہبی تعصب ہے جو انسان کو مجبور کرتا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے دوسروں کے خلاف کچھ نہ کچھ کہہ ضرور ڈالے۔

اعتراض کے جواب سے پہلے یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ جزیہ کیا چیز ہے، اور ذمّی کس کو کہتے ہیں؟

"اہلِ کتاب اور مشرکینِ عجم اگر مغلوب و مقہور ہو کر اسلامی اقتدار کو تسلیم کر لیں اور سالانہ تھوڑا سا ٹیکس ادا کر کے اس شرط پر اسلامی حکومت کے زیرِ اقتدار آ جائیں کہ حکومت اُن کے جان، مال اور آبرو کی محافظ رہے تو ایسے ٹیکس کو "جزیہ" کہتے ہیں[1]"

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ ۱۱۸ (مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی)

بعد حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میرے زمانۂ خلافت میں ویسا نہیں ہوا۔

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے زمانۂ خلافت میں گشت کرتے ہوئے ایک بہت بوڑھے اور اندھے شخص کو دیکھا کہ کسی کے دروازے پر صدا لگا رہا ہے آپ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا، تمھارا کیا مذہب ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں، آپ نے پوچھا کہ بھیک کیوں مانگتے ہو؟ اُس نے کہا کہ ضعیفی، تنگ دستی و مفلسی کی وجہ سے اور جزیہ ادا کرنے کے لئے۔ یہ سن کر آپ اس کو اپنے ساتھ مکان پر لے گئے، اور کچھ نقد اپنے پاس سے دے کر بیت المال کے افسر کے پاس کہلا بھیجا کہ اس بوڑھے شخص کا اور اس جیسے تمام لوگوں کا خیال رکھا جائے، خدا کی قسم یہ کوئی انصاف کی بات نہیں ہے کہ اس کی جوانی کی کمائی ہم نے کھائی اور اب بڑھاپے کے وقت ہم اُس کو رسوا و ذلیل کریں۔ پھر آپ نے کہا صدقے کی نسبت جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ فقیروں اور مسکینوں کو دینا چاہیئے" تو فقیروں سے مسلمان اور مسکینوں سے اہلِ کتاب مراد ہیں۔

اس واقعے کے بعد آپ نے جتنے اس قسم کے لوگ تھے سب کا جزیہ معاف کر کے اسلامی خزانے سے اُن کا وظیفہ مقرر کر دیا۔[1]

الجزیہ پر مختصر بحث

اسلام نے تعصب سے بچنے کا حکم اس لئے دیا ہے کہ یہ انسان کی عقل پر

---

[1] التسامح فی الاسلام صفحہ ۲۶ (تالیف الاستاذ محمد احمد حسونہ)

تحریر فرماتے ہیں۔

"ہم کو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ جزیہ اصل میں فارسی کا لفظ ہے، تصریحات لغت کے علاوہ تاریخی قرینہ نہایت قوی موجود ہے، یہ مسلّم ہے کہ اسلام سے پہلے عرب میں جزیہ کا لفظ مستعمل ہو چکا تھا۔ یہ بھی مسلم کہ فارسی میں گزیت کا لغت اسی معنی میں قدیم سے شائع ہے، تاریخی شہادتوں سے ثابت ہے کہ نوشیرواں نے جزیہ کے قواعد مقرر کئے تھے، اور اس زمانے میں نوشیرواں کے عمّال یمن اور مضافاتِ یمن پر منصوب تھے، اس طرح گزیت کا لفظ قانونی طور پر عرب میں پھیلا، اور معرب ہو کر گزیہ ہو گیا، یہ عام قاعدہ ہے کہ محکوم ملک میں جب فرماں روا زبان کے الفاظ دخل پانے لگتے ہیں تو سب سے پہلے وہ الفاظ آتے ہیں جو سلطنت کے قانونی الفاظ ہوتے ہیں[1]"

اپنی تائید میں مولانا شبلی نعمانی نے تاریخ طبری کے حوالے سے لکھا ہے کہ خراج و جزیہ کے قواعد نوشیرواں کے زمانے میں مرتب ہوئے، اور گھٹا بڑھا کر اسلام نے ان کو اپنا لیا۔

مشکل پسند لوگوں کو چھوڑ کر اکثر و بیشتر انسان فوجی خدمت سے گھبراتے اور گریز کرتے ہیں، اسلام نے جو نظامِ حکومت قائم کیا تھا، اس کی رُو سے ہر مسلمان فوجی خدمت کے لئے مجبور کیا جا سکتا تھا، یہ ایک سخت قانون تھا، اور بہت سی تن آسان طبیعتیں اس کو پسند نہ کرتی تھیں، اس کی سختی کو کم کرنے کے لئے اسلام نے فوج کے لوگوں کو جو کہ عموماً مسلمان ہوتے تھے، جزیہ سے

---

[1] مقالاتِ شبلی صفحہ ۲۲۳

"ذمیّ اُس کو کہتے تھے جو اسلام کے زیرِ حکومت ہو، اور جزیہ ادا کرتا ہو، اس کو یہ حقوق حاصل تھے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنے خدا کی عبادت کر سکتا تھا، اُس کو اسلام پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا، وہ قوانینِ سلطنت کا پابند ہوتا تھا، اور شخصی قانون مثلاً نکاح، طلاق، وراثت میں اُس کے مذہب کے موافق عمل کیا جاتا تھا، البتہ جب کسی معاملے میں اس کا فریق ثانی مسلمان ہوتا تو مذہبِ اسلام کے مطابق عمل ہوتا تھا۔

یہ سخت غلطی ہے کہ ذمی کے لفظ سے دنی اور بزدل کے معنی مراد لئے جائیں، درحقیقت اس لفظ کے معنی امان یافتہ کے ہیں[1]"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ذمّیوں کے متعلق ارشاد فرمایا۔

لَهُمْ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ	ذمی ہو جانے کے بعد وہ (کافرین) اللہ اور اس کے رسول کی ذمہ داری میں آ گئے[2]

اور حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ فرمایا۔

اِنَّمَا قَبِلُوْا عَقْدَ الذِّمَّةِ لِتَكُوْنَ اَمْوَالُهُمْ كَاَمْوَالِنَا وَدِمَاؤُهُمْ كَدِمَائِنَا	انھوں نے ذمّی ہونا قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ اُن کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کی جانیں ہماری جانوں کی طرح محفوظ ہو جائیں[3]۔

اور یہ کہنا صحیح معلوم نہیں ہوتا کہ لفظ "الجزیہ" کا موجد اسلام ہے، لفظ جزیہ فارسی لفظ گزیت سے معرب ہے جس کے معنی خراج کے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی

---

[1] مقالات شبلی حصّہ اوّل صفحہ ۱۴۴ - ۱۴۵ [2] اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ ۱۱۴ (بحوالہ کتاب الاموال لابی عبید) [3] اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ ۱۱۵

توجہ کی ، بڑے زمینداروں کی زیادتیوں سے جو کاشتکاروں کے لئے سوہانِ روح بنی ہوئی تھیں نجات دلائی ۔ سابق مقرر شدہ لگان پر نظرِ ثانی کرکے اس میں کاٹ چھانٹ کی ، آبپاشی کی شکستہ نالیوں کی مرمت کرائی ، اور نئی نالیاں بنوائیں ، کاشتکار یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر وہ سرکاری لگان ادا کرتے رہیں گے تو کوئی شخص اُن کو زمینوں سے بے دخل نہیں کرسکتا ۔ ہر شخص آزادیٔ ضمیر کو اپنا پیدائشی حق تصوّر کرنے لگا ، مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ کسی کے مذہبی معاملات میں ہرگز دخل نہ دیں ، جو لوگ اپنے عقائد اور مذہب پر قائم رہنا چاہتے تھے اُن کو ذمّی (وہ لوگ جن کی حفاظت کی اسلامی حکومت ذمہ دار تھی) کہا جاتا تھا ، حکومت کا قانون تھا کہ وہ جس وقت چاہے جس مسلمان کو فوجی خدمات کے لئے بلا سکتی ہے ، اس لئے وہ مسلمانوں سے صرف عُشر لیتی تھی ، غیر مسلموں کی اکثریت نے کسی قسم کی زبردستی اور دباؤ کے بغیر ، جس کو کہ موجودہ زمانے کی مہذّب تو میں کچّے عقائد کے لوگوں پر استعمال کرتی ہیں ، اسلام قبول کرلیا ۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مسلمانوں پر جزیہ کا نہ ہونا غیر مسلموں کو یہ ترغیب دینے کے لئے تھا کہ اگر وہ اسلام قبول کرلیں گے تو اُن سے بھی جزیہ نہ لیا جائے گا[1]۔

سیّد امیر علی نے زیادہ زور اس بات پر دیا ہے کہ ذمّی فوجی خدمات سے

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "شارٹ ہسٹری آف دی سارا سینس" صفحہ ۳۳ - ۳۴

A Short History of the Saracens

By Syed Ameer Ali P.33-34

بری کر دیا، نوشیرواں نے بھی فوجیوں پر جزیہ نہیں لگایا تھا، غیر مذاہب کے لوگ جو اسلامی حکومت میں رہتے سہتے تھے، اور جن کی حفاظت کی وہ ذمہ دار تھی، اُن کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلامی حکومت کو کوئی حق نہ تھا، اور نہ وہ لوگ خود ایسی پُرخطر خدمات کے لئے آسانی سے آمادہ ہو سکتے تھے، اس لئے اُن کی حفاظت کے معاوضے میں اُن سے جزیہ لیا جاتا تھا۔ تاریخی شہادت موجود ہے کہ اگر کسی موقعے پر غیر قوموں کے لوگ فوج میں شریک ہو گئے یا انھوں نے شرکت کے لئے پوری آمادگی ظاہر کی تو اُن کو بھی جزیہ سے بری کر دیا گیا۔

پروفیسر آرنلڈ (Arnold) لکھتے ہیں۔

"عیسائیوں کا یہ خیال غلط ہے کہ اُن پر اسلامی حکومت نے جزیہ اسلام قبول نہ کرنے کی سزا میں لگایا تھا، جزیہ وہ تمام ذمّی یا غیر مسلم ادا کرتے تھے جن کا مذہب ان کو اسلامی فوج میں شرکت سے روکتا تھا، اور یہ جزیہ اُن سے حفاظت اور فوجی خدمات سے مستثنیٰ ہونے کی بنا پر لیا جاتا تھا"[1]

آگے چل کر پروفیسر موصوف لکھتے ہیں۔

"یہ بات زیادہ قابلِ غور ہے کہ جب کوئی عیسائی اسلامی فوج کی خدمت قبول کر لیتا تو اس سے جزیہ نہ لیا جاتا تھا"[2]

سیّد امیر علی نے ایران کی فتح کے بعد اسلامی اصلاحات اور اسلامی رواداری کا ذکر ذیل کی عبارت میں کیا ہے۔

"خلیفۂ وقت نے کاشتکاروں کے حقوق کی حفاظت کے لئے پہلی فرصت میں

---

[1] ملخص از پریچنگ آف اسلام صفحہ ۵۴-۵۵ [2] ایضاً صفحہ ۵۵

لوگوں کی بجائے اگر اس موقع پر رومی ہوتے تو واپس دینا تو درکنار، جو تھوڑا بہت اور ہمارے پاس ہوتا تو وہ بھی لے لیتے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرت ابو عبیدہؓ کے اس حکم کی تعمیل سب سے پہلے حمص میں ہوئی، جہاں اس وقت وہ خود ٹھہرے ہوئے تھے، انھوں نے حبیب بن مسلمہ کو بلا کر حکم دیا کہ جو کچھ ذمیوں سے وصول کیا گیا ہے سب واپس کر دو، اس کے بعد حضرت ابو عبیدہؓ دمشق تشریف لے گئے، اور وہاں بھی ذمیوں سے وصول کی ہوئی رقم کی واپسی کا حکم دیا۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دل نوازی کا
مروّت حسن عالم گیر ہے مردانِ غازی کا (اقبالؒ)

مروّت وانسانیت، اسلامی رواداری اور اس کے مفید نتائج کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو سکتی ہے کہ مفتوح قوم کے لوگ فاتح قوم سے کہہ رہے ہیں، "خدا پھر تم کو ہمارے شہروں میں لائے" اگر کوئی مفتوح قوم فاتح قوم کے کردار اور حسنِ سلوک سے اس درجے متاثر ہونے کے بعد اس کا دین و مذہب قبول کرے تو کیا پھر بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ فاتحین نے تلوار کے زور اور زبردستی سے مفتوحین کو اپنا ہم مذہب بنا لیا۔

"الفاروق" میں علّامہ شبلی نعمانی نے اسلام میں ذمی رعایا کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"ایک خاص بات جو سب سے بڑھ کر قابلِ لحاظ ہے، یہ ہے کہ اگر ذمیوں نے کبھی سازش یا بغاوت کی، تب بھی اُن کے ساتھ مراعات کو ملحوظ رکھا، آج کل جن حکومتوں کو تہذیب و ترقی کا دعویٰ ہے، رعایا کے ساتھ ان کی تمام عنایت

مستثنیٰ تھے، اس لیے اُن سے جزیہ نہ لیا جاتا تھا، بعض روایات اور ان صحابہ کرام کے خطوط سے جو کہ اسلامی فوج میں اعلیٰ عہدوں پر تھے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ ذمیوں کی حفاظت کا معاوضہ تھا، ہوسکتا ہے کہ جزیہ لینے کی دو وجہ ہوں، ذمیوں کی حفاظت کی ذمہ داری، اور اُن کا فوجی خدمات سے مستثنیٰ ہونا اور فوقیت پہلی وجہ کو ہو۔

جزیہ لینے کے بعد اسلامی حکومت پوری ذمہ داری محسوس کرتی تھی، کہ ذمیوں کی حفاظت کی جائے، اور اگر حکومت کے ذمہ دار لوگوں کو کسی موقع پر یہ اندازہ ہو جاتا کہ وہ حفاظت نہ کر سکیں گے، تو جزیہ واپس کر دیا جاتا، حضرت ابو عبیدہؓ بن الجراح کو شام میں جب بسلسل فتوحات ہوئیں تو ہرقل نے بڑے پیمانے پر حملہ کرنے کے لئے فوجی تیاریاں شروع کر دیں، مسلمانوں کو اس کے مقابلے کے لئے بڑی مستعدی سے کام کرنا پڑا۔ انھوں نے پوری قوت اور توجہ فوجی انتظامات پر صرف کر دی، لیکن اس کے باوجود ان کو اپنی تیاری پر اطمینان نہ ہوا۔ حضرت ابو عبیدہؓ اسلامی فوج کے بڑے افسر نے حضرت عمر فاروقؓ کے ایما سے اپنے تمام ان حکام کو جو شام کے مفتوحہ علاقوں پر مامور تھے، لکھ بھیجا کہ جو کچھ لوگوں سے وصول کیا گیا ہے سب واپس کر دو اور ان سے یہ کہہ دو کہ ہم نے تم سے جو کچھ لیا تھا وہ اس شرط پر لیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ہم دشمنوں سے تمھاری حفاظت کریں گے، اب موجودہ حالات میں ہم حفاظت کی ذمہ داری نہیں لے سکتے، لیکن اگر ہماری فتح ہوئی تو ہم معاہدے کے پابند رہیں گے، عیسائی مسلمانوں کو دلی دعائیں دیتے ہوئے نہنے لگے، خدا پھر تم کو ہمارے شہروں میں لائے، تم

دشمنوں کے ہر قسم کے راز مسلمانوں سے آکر کہتے تھے، حالانکہ یہ دشمن ان ہی کے ہم مذہب عیسائی یا پارسی تھے، ذمّیوں کو مسلمانوں کے حسنِ سلوک کی وجہ سے جو اخلاص پیدا ہوگیا تھا اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جنگِ یرموک کے پیش آنے کے وقت جب مسلمان شہر حمص میں سے نکلے تو یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا جب تک ہم زندہ ہیں رومی نہ آنے پائیں گے، عیسائیوں نے نہایت حسرت سے کہا کہ خدا کی قسم تم رومیوں کی بہ نسبت کہیں ہم کو بڑھ کر محبوب ہو۔[1]

جزیہ کی رقم زیادہ تر عام ملکی مصالح پر صرف کی جاتی تھی جس سے کہ ذمّی بھی مستفید ہوتے تھے۔ ذمّیوں کے مال سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچنا کوئی بےجا بات اس لئے نہ تھی کہ صدقات کی رقم جو مسلمانوں سے وصول کی جاتی تھی اس میں ذمّی رعایا برابر کی شریک و سہیم تھی۔

آج دنیا کی متمدن حکومتیں مختلف قسم کے ٹیکس جس بےدردی سے لگاتی اور اُن کے وصول کرنے میں جو جو سختیاں کرتی ہیں اس کو بتانے کی ضرورت نہیں لیکن اسلامی حکومت کے افسروں کو یہ حکم تھا کہ جزیہ وصول کرنے میں سختی نہ کی جائے۔ اور اگر خلیفۂ وقت کو کسی طرح سے یہ معلوم ہو جاتا کہ کسی افسر نے جزیہ وصول کرنے میں غیر معمولی سختی کی ہے تو اس کو تنبیہہ کی جاتی۔

حضرت عمر فاروقؓ اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ شام سے واپس تشریف لا رہے تھے، راستے میں آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کو تیز دھوپ میں کھڑا کرکے

---

[1] الفاروق حصّہ دوم صفحہ ۱۳۷ (تالیف علامہ شبلی نعمانی)

اسی وقت تک ہے جب تک اُن کی طرف سے کوئی پولٹیکل (Political) شبہ نہ پیدا ہو، ورنہ دفعتہً وہ تمام مہربانی غضب اور قہر سے بدل جاتی ہے، اور ایسا خوں خوارا ور پُرغیظ انتقام لیا جاتا ہے کہ وحشی قومیں بھی اس سے کچھ زیادہ نہیں کرسکتیں، برخلاف اس کے حضرت عمرؓ کا قدم کسی حالت میں جادۂ انصاف سے ذرا نہیں ہٹا، شام کی آخری سرحد پر ایک شہر تھا، جس کا نام عربسوس تھا، اور جس کی دوسری سرحد ایشیائے کوچک سے ملی ہوئی تھی، شام جب فتح ہوا تو صلح کا معاہدہ ہوگیا، لیکن یہاں کے لوگ در پردہ رومیوں سے سازش رکھتے تھے، اور اِدھر کی خبریں اُن کو پہنچاتے تھے، عُمیر بن سعد وہاں کے حاکم نے حضرت عمرؓ کو اطلاع دی، حضرت عمرؓ نے ان کی کمینہ خصلت کا جو انتقام لیا وہ یہ تھا کہ عمیر بن سعد کو لکھ بھیجا کہ جس قدر اُن کی جائداد، زمین، مویشی، اور اسباب ہے سب شمار کرکے ایک چیز کی دوچند قیمت دے دو، اور اُن سے کہو اور کہیں چلے جائیں، اور اس پر بھی راضی نہ ہوں، تو ان کو ایک برس کی مہلت دو، اور اس کے بعد جلاوطن کردو، چنانچہ جب وہ اپنی شرارت سے باز نہ آئے تو اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ کیا آج کل کوئی قوم اس درگذر و عفو و مسامحت کی کوئی نظیر دکھا سکتی ہے؟ ذمیوں کے ساتھ جو لطف و مراعات کی گئی تھی اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ ذمیوں نے ہر موقع پر اپنے ہم مذہب سلطنتوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا ساتھ دیا، ذمی ہی تھے جو مسلمانوں کے لئے رسد بہم پہنچاتے تھے، لشکرگاہ میں مینا بازار لگاتے تھے، اپنے اہتمام اور صرف سے سڑک اور پل تیار کراتے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جاسوسی اور خبررسانی کرتے تھے، یعنی

امیر معاویہؓ کے عہد میں ہوئی، یعنی ابن آثال ایک عیسائی حمص کا فنانشل کمشنر اور وہاں کا حاکم مقرر ہوا، رفتہ رفتہ کوئی بڑے سے بڑا منصب اور عہدہ ایسا نہیں رہا جو غیر مذہب والوں کی دسترس سے باہر رہا ہو۔[1]"

سلمویہ بن بنان عیسائی کو خلیفہ معتصم باللہ کے دربار میں یہ عزت حاصل تھی کہ معتصم کا کوئی فرمان سلمویہ کے دستخط کے بغیر جاری نہیں ہوتا تھا۔ معتصم کہا کرتا تھا کہ سلمویہ میرے نزدیک قاضی القضاۃ سے بڑھ کر ہے۔ سلمویہ جب بیمار ہوا تو معتصم خود اس کی عیادت کے لئے گیا، اور اس کی حالت دیکھ کر بے اختیار رونے لگا۔ سلمویہ کے مرنے کی خبر سن کر معتصم نے تمام دن کھانا نہیں کھایا، اور حکم دیا کہ اس کا جنازہ شاہی محل میں لاکر رکھا جائے اور عیسائی مذہب کے مطابق شمع اور بخور جلا کر جنازے کی نماز ادا کی جائے۔

اسلام میں غیر مسلموں کے مالی حقوق

مقالات شبلی میں ہے۔

" مال اور جائداد کے حقوق جن کو انگریزی میں رائٹس آف پراپرٹی (Rights of Property) اور رائٹس آف لینڈ (Rights of Land.) سے تعبیر کیا جاتا ہے، اُن میں مسلمان اور ذمّی برابر درجہ رکھتے تھے۔ ذمّیوں کے قبضے میں جس قدر زمینیں تھیں، اسلام کے بعد عموماً بحال رکھی گئیں، یہاں تک کہ اگر خلیفۂ وقت یا بادشاہ کو مسجد یا کسی اور عمارت کی غرض

---

[1] مقالات شبلی صفحہ ۲۱۸

اُن کے سروں پر تیل ڈالا جا رہا ہے، آپ نے دریافت فرمایا کہ ان لوگوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کیوں کیا جا رہا ہے، لوگوں نے کہا کہ انھوں نے اب تک جزیہ ادا نہیں کیا ہے، اس لئے اُن کو سزا دی جا رہی ہے، آپ نے دریافت فرمایا تم نے ان لوگوں سے بھی جزیہ ادا نہ کرنے کی وجہ پوچھی، سزا دینے والوں نے کہا کہ یہ لوگ تو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ ہے ہی نہیں، دیں کہاں سے؟ حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ پھر تم ان کو کسی ایسے کام کے لئے کیوں مجبور کرتے ہو جس کو یہ کر ہی نہیں سکتے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سنا ہے کہ "لوگوں کو تکلیف نہ پہنچانا چاہیئے، جو شخص لوگوں کو دنیا میں ستائے گا، اللہ تعالےٰ اُس کو قیامت کے دن تکلیف پہنچائے گا"۔ یہ حدیث سنانے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے اُن کے چھوڑ دیئے جانے کا حکم دیا۔[1]

اسلامی تعلیمات پر صحیح طور پر عمل کرنے والی اسلامی حکومتوں نے اپنی اقلیتوں کو پوری پوری آزادی دی، ان کی وفاداری پر اعتماد کرکے ان کو بڑے بڑے عہدے دیئے، اور جب ان لوگوں نے دیکھا کہ حکومت ہمارے اوپر بھروسہ کرتی ہے تو موقع پڑ جانے پر جان جیسی پیاری چیز دینے تک سے دریغ نہ کیا۔

اسلامی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں۔

"رفتہ رفتہ جدید تمدن نے زیادہ ترقی کی، اور ملکی اور فوجی صیغے میں فی الجملہ امتیاز ہوا تو ذمیوں کو ملکی صیغے میں بار ہونے لگا۔ سب سے پہلے اس کی ابتدا

---

[1] کتاب الخراج (امام ابو یوسفؒ) صفحہ ۱۲۵

اور بعض حق پرست غیر مسلموں نے اسلام کی ان تعلیمات کو سراہا ہے جن میں غیر مسلموں کی مذہبی آزادی نہ صرف تسلیم کی گئی ہے بلکہ مسلمانوں کو اس کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔

فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ جب گرجا ملاحظہ کر رہے تھے تو وہیں کسی نماز کا وقت آگیا، بطریق نے کہا کہ آپ یہیں نماز ادا کرلیں، لیکن آپ نے یہ کہتے ہوئے وہاں نماز پڑھنے سے انکار کر دیا کہ کہیں بعد میں آنے والے مسلمان سنت عمری کی تقلید میں اس گرجا کو مسجد میں تبدیل نہ کرلیں[1]۔

"تمدن عرب" میں ہے۔

"بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ کا اخلاق ہم پر ثابت کرتا ہے کہ ملک گیران اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیسا نرم سلوک کرتے تھے، اور یہ سلوک اس مدارات کے مقابل میں جو صلیبیوں نے اُسی شہر کے باشندوں سے کئی صدی بعد کی نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے، حضرت عمرؓ اس شہر مقدس میں بہت تھوڑے اشخاص کے ساتھ داخل ہوئے، اور آپ نے سفر ونیس بطریق سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت میں آپ کے ہمراہ چلے، اس وقت حضرت عمرؓ نے منادی کرادی کہ میں ذمہ دار ہوں کہ باشندگان شہر کے مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حرمت کی جائے گی، اور مسلمان عیسائی گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہوں گے[2]"

---

[1] پریچنگ آف اسلام صفحہ ۵۱ The Preaching of Islam P. 51.

[2] تمدن عرب صفحہ ۱۳۲ (مترجم علامہ سید علی بلگرامی)

سے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تھی تو معاوضہ دے کر لی جاتی تھی[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو معاہدہ نجران کے عیسائیوں سے کیا، اس میں آپ نے اُن کی جان، مال، عزت و آبرو اور مذہبی پیشواؤں کی حفاظت کا پورا پورا اطمینان دلایا، اسی طرح نجران کے عیسائیوں کا وفد جو بڑے بڑے پادریوں پر مشتمل تھا، جب خدمتِ نبوی میں باریاب ہوا تو آپ نے اس کو صحنِ مسجد میں اُتارا، اور جب ان لوگوں کی نماز کا وقت آیا تو مسجدِ نبوی میں اُن کے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی ان کو اجازت دی۔

ادب المفرد میں امام بخاری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار پرسی کے لئے ایک یہودی غلام کے یہاں جب وہ بیمار ہوا تشریف لے گئے۔

آپ کے بعد خلفائے راشدین اور دوسرے صحابۂ کرام کا بھی ہر موقع پر غیر مسلموں کے ساتھ بہت فیاضانہ سلوک رہا۔ اگر صرف ان معاہدوں اور واقعات کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے کہ جن میں مسلمان فاتحین اور حکمرانوں نے غیر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ روادارانہ برتاؤ اور فیاضانہ طرزِ عمل اختیار کیا تو ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔

یورپ کا وہ گروہ جو اسلام پر بے سوچے سمجھے نکتہ چینی کرتا رہتا ہے، اس کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی نہیں ہے، اور قدیم اسلامی حکومتوں نے غیر قوموں کے مذہبی حقوق بالکل پامال کر دیئے تھے، لیکن مستند اسلامی تاریخ کے ایک دو نہیں بہت سے واقعات اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں،

---

[1] مقالاتِ شبلی صفحہ ۱۹۳

بھی دنیا اُن کو اعلیٰ تہذیب و تمدّن کے لئے لازمی اور ضروری سمجھتی ہے۔ یہ خاص بات ہے کہ اسلام نے اخلاقی اصول برتنے اور دوسروں کے جذبات کا خیال رکھنے میں اپنوں اور غیروں میں کوئی ایسا فرق نہیں روا رکھا ہے جس کو دوسرے مذاہب کے لوگ اپنے لئے باعثِ توہین و تذلیل خیال کریں، بعض ایسے مواقع آجاتے ہیں کہ ایک مذہب کا انسان دوسرے مذہب والے کے ساتھ محض اختلاف مذہب کی وجہ سے عدل و انصاف نہیں کرنا چاہتا، اسلام نے یہ تاکید کی ہے کہ خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں، تم عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو۔

قرآن کریم میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ٥ (المائدہ)	مسلمانو! ایسے ہو جاؤ کہ خدا (کی سچائی) کے لئے مضبوطی سے قائم رہنے والے اور انصاف کے لئے گواہی دینے والے ہو، اور (دیکھو) ایسا کبھی نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی تمھیں اس بات کے لئے ابھار دے کہ (اس کے ساتھ) انصاف نہ کرو (ہر حال میں) انصاف کرو کہ یہی تقوی سے لگتی ہوئی بات ہے اور اللہ (کی نافرمانی کے نتائج) سے ڈرو۔ تم جو کچھ کرتے ہو، وہ اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ (ترجمان القرآن)

یعنی کسی قوم کی دشمنی اور عداوت تم کو اس بات کا مجرم نہ بنا دے کہ تم موقع آنے پر عدل سے کام نہ لو، غور کیجئے کتنا بہترین اور بے نظیر قانون اسلام نے بنایا ہے، جتنی مراعات غیر مسلموں کو دی جاسکتی تھیں اسلام نے سب اپنے اس جامع قانون کے ذریعے دیدیں۔

اسی کتاب میں فرانسیسی مؤرّخ ڈاکٹر لیبون نے مسلمانوں کی رواداری کا نقشہ ذیل کے الفاظ میں کھینچا ہے۔

"عربوں نے اندلس کے باشندوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو انھوں نے شام و مصر میں کیا تھا۔ اُن کا مال، ان کے کلیسے، ان کے قوانین انھیں وسئے اور اپنے ہم قوم حکام کے زیرِ انصاف رہنے کے حقوق انھیں عطا کئے، ایک سالانہ جزیہ بہ چند شروط ان پر لگایا گیا، جو امراء کے لئے ایک دینار سرخ اور عامۂ خلائق کے لئے نصف دینار تھا۔

یہ شرائط اس قدر نرم تھیں کہ رعایا نے بلا تکرار انھیں قبول کرلیا، اور عربوں کو بجز بڑے بڑے جاگیرداروں کے کسی سے مقابلے کی ضرورت باقی نہ تھی۔ یہ لڑائی بھی تھوڑے ہی دنوں باقی رہی، دو سال کے اندر مقابلہ موقوف اور ملک پر پورا تسلّط ہوگیا، یہ تسلّط البتہ دائمی نہ تھا لیکن نصرانیوں کو ملک واپس لینے کے لئے آٹھ صدیاں گذر گئیں[1]"

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں اکبر نے جیسی "اسلامی رواداری" کا ثبوت دیا وہ تو سب کو معلوم ہے ہی، لیکن اکبر کے علاوہ جہاں گیر، شاہ جہاں اور عالم گیر کے روادارانہ سلوک کے واقعات آج بھی تاریخ کی کتابوں میں موجود ہیں، اور ان سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔

اسلام نے اخلاق اور حسنِ معاشرت کے جو اصول بتائے ہیں وہ محبّت، یگانگت اور آپس کی ہمدردی کو بڑھانے والے ہیں، اور اس قدر پکّے ہیں کہ آج

---

[1] تمدّنِ عرب صفحہ ۲۴۸-۲۴۹

پیغمبرِ اسلام کی بعثت کے وقت دنیا کے مختلف حصّوں میں لوگوں پر احساسِ برتری کا بھوت سوار تھا، کوئی قوم یہ کہتی تھی کہ ہم تو دیوتاؤں کی نسل سے ہیں۔ کسی کو یہ گھمنڈ تھا کہ جو خون ہماری رگوں میں دوڑ رہا ہے، وہ وہ خون نہیں ہے جو عام لوگوں کی رگوں میں ہے، اور کوئی اس پر پھولا ہوا تھا کہ دیوتا کے سر سے پیدا ہونے والے لوگ اُن لوگوں سے یقیناً افضل و اشرف ہیں جو دیوتا کے پیر سے پیدا ہوئے ہیں۔ ایران اور روما کے شہنشاہ اپنا سلسلہ نسب خالق کائنات سے جوڑتے تھے، لوگ اُن کو سجدہ کرتے اور خدائی صفات سے متصف سمجھتے تھے۔ خالقِ انسان کے علم میں یقیناً یہ بات تھی کہ عدم مساوات کے اس غیر فطری نظریے کی کمزوری، اور اُس کے نقصان رساں ہونے کو انسان پورے طور پر ہزاروں برس میں بھی نہ سمجھ پائے گا، اس لئے اس نے خاتم النبیین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب اُتاری اُس میں اس باطل نظریے کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے، اور فرما دیا۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً	اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان دار سے پیدا کیا، اور اس جان دار سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔
(النساء)	(بیان القرآن)

مطلب یہ ہے کہ تمام انسان ایک اصل سے اور آپس میں نسبی بھائی ہیں، انسانی برادری کی کنبوں اور قبیلوں میں تقسیم شناخت کے لئے ہے نہ کہ تفاخر

اسلامی مساوات

ہر وہ کام جو سماجی زندگی میں خرابی پیدا کرنے والا ہو، اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، کیونکہ اس کا بڑا مقصد سماجی زندگی کی اصلاح اور ہر انسان کی افادیت بڑھا کر اس کو سماجی مشین کا ایک بہترین پرزہ بنانا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث رسول میں مسلمانوں کے لئے خصوصی تعلیمات کے علاوہ بہت سی ایسی تعلیمات ہیں کہ جن کا تعلق عام انسانوں سے ہے، مسلمانوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مروّت، ہمدردی، اور رحم و کرم سے پیش آئیں، اور کوئی ایسی بات ہرگز نہ کریں کہ جس کی وجہ سے باہم انسانوں میں نفرت پیدا ہو، اسلام جس کا دعویٰ یہ تھا اور ہے کہ وہ تمام انسانوں کے لئے مشعلِ راہ بن کر آیا ہے، اپنی تعلیمات میں اس قسم کی کوئی بات کب گوارا کر سکتا ہے کہ جس کی وجہ سے انسانوں میں نفرت و عداوت کی کوئی خلیج حائل ہو جائے۔

اسلام کی نظر میں ایک انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت صرف تقویٰ کی وجہ سے ہوسکتی ہے، وہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ اختلافِ عقیدہ کی بنا پر دوسرے لوگوں کو انسانیت سے خارج کر دیا جائے، اور ان کی عزت و آبرو اور جان و مال کی کوئی قیمت نہ رہے، نسل و رنگ کا امتیاز مٹانے میں جس قدر جامع تعلیمات اسلام نے پیش کی ہیں دوسرے مذاہب میں اس قدر جامعیت کے ساتھ نہیں ملتیں، اور یہ اسلام کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان ہے۔

دنیا کی مہذب قوموں نے انسانوں کو جغرافی حدود اور نسلی خصوصیت کے بندھنوں میں جکڑ کر رکھ دیا، رومیوں کی ہزار سالہ حکومت رومی وطنیت کے سہارے پر قائم رہی، یہودیوں، پارسیوں اور دوسری بہت سی قوموں کی قومیت نسلی امتیاز پر مبنی ہے، یورپ کی موجودہ قومیتیں نسل و وطن کی دوہری دیواروں پر کھڑی ہیں لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ جغرافی حدود، اور نسلی و وطنی خصوصیات نے قوموں کو کتنا تنگ نظر، محدود خیال اور متعصب بنا دیا ہے، ایسی قومیں اپنی قوم کا بھلا چاہیں گی یا انسانیت کا؟ جواب ظاہر ہے کہ اپنی قوم کا، دنیا میں اکثر جنگیں، خونریزیاں، اور قومی منافرتیں اس قسم کے جذبات کا ادنیٰ کرشمہ ہیں، اور اس وقت آپس میں دست و گریباں ہونے کے لئے جو قومیں آستینیں چڑھا رہی ہیں، اس کا اصلی سبب نسلی و وطنی جذبات کے وہ شعلے ہیں جو سینوں میں دہک رہے ہیں، یہ نسلی اور وطنی افتراق قوموں کے درمیان وہ خلیج ہے جس کا پاٹنا بظاہر ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، اور اس کے ہوتے ہوئے کسی عالمگیر امن و صلح، اور انسانی برادری کے دائرے کے وسیع ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی، البتہ اگر بین الاقوامیت

تفاخر کے لئے، خدا کے دربار میں تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرنے والوں کو تقرب حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات)	اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، اور اللہ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں تقویٰ کو معیارِ فضیلت قرار دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر میر ولی الدین اپنی کتاب "قرآن اور تعمیر سیرت" میں تقویٰ کا اجمالی مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اجمالاً یوں سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے معبود ہیں اور محبوب ہیں تو ہمارا ہر کام ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت میں شامل ہو جائے، یعنی اُن ہی کے امتثالِ امر میں ہو، ان ہی کی رضامندی و خوشنودی کی خاطر ہو، نفس و ہوا کی پیروی میں نہ ہو، یعنی لذت اندوزی کے لئے نہ ہو، عیش پرستی کے لئے نہ ہو، جاہ طلبی کے لئے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت اللہ کی ہو، غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے ہر فعل کا تعین امر حق سے ہو نفس و شیطان کے حکم سے نہ ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کی زندگی ہے، اور یہی کامیاب زندگی ہے"[1]

---

[1] قرآن اور تعمیر سیرت صفحہ ۲۳۵ (ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن)

ان کے پردے میں انسانی شرف اور کرامت کی زیادہ سے زیادہ مٹی پلید کی جا سکے، اور نئے نئے ڈھنگوں سے انسانیت کو پامال کیا جا سکے۔ ان باتوں کے ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں، تہذیب حاضر کی نمائندگی کرنے والی قوموں کے حالات اس کی خود دلیل ہیں۔

نسل، قومیّت، کلیسا، سلطنت، تہذیب، رنگ
خواجگی نے خوب چُن چُن کر بنائے مسکرات (اقبالؒ)

اسلام اور انسانی حقوق

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں انسان اور انسانیت کے احترام کے لئے جو کچھ ارشاد فرمایا، اگر آج اس پر عمل کیا جائے تو بہت سے وہ جھگڑے بالکل ختم ہو جائیں جو شرفِ انسانی کو ٹھیس لگ جانے سے پیدا ہوتے ہیں، آپ نے بہت صاف الفاظ میں یہ فرمایا کہ انسانی ترقی اور اس کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں پوشیدہ ہے، یہ قطعاً ناممکن ہے کہ انسانیت مبتذل و پامال ہو، اور انسان ترقی کے مدارج طے کرلے، اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ آپ کی بعثت کے وقت دنیا کے مختلف حصّوں اور حکومتوں میں طبقاتی تقسیم کا عام رواج تھا، روما کی حکومت کے مشہور قانون داں جب قانون بنانے بیٹھے تو انھوں نے بھی انسانوں کو ایسے مختلف طبقات میں تقسیم کر ڈالا جن کے حقوق کا تعیّن نسل، رنگ، مذہب، وطن اور دولت وغیرہ کے لحاظ سے کیا جانے لگا، دو انسان ایک ہی جرم کے مرتکب ہوتے، لیکن دونوں کو جو سزا دی جاتی وہ

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی جائے تو یہ کٹھن کام آسان ہوسکتا ہے۔ قاضی محمد سلیمان صاحب منصور پوری نے لکھا ہے۔

" ہاں رحمۃ للعالمین وہی ہے، جس نے ملکوں کی دوری، اقوام کی بیگانگی، رنگتوں کا اختلاف، زبانوں کا تباین دور کرکے سب کے دلوں میں ایک ہی ولولہ، سب کے دماغوں میں ایک ہی تصوّر، سب کی زبانوں پر ایک ہی کلمہ جاری کر دیا ہو"

۔ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے کہ دو انسان جو ایک فضا میں سانس لیتے ایک غذا کھاتے، ایک حکومت کے سائے میں رہتے اور ایک ہی تہذیب و تمدن رکھتے ہیں، صرف اس بات پر کھنچے کھنچے اور ایک دوسرے سے متنفّر رہتے ہیں کہ ایک گورے رنگ کا ہے اور دوسرا کالے رنگ کا، کالے رنگ والے کو محض کالا ہونے کی وجہ سے یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ گورے رنگ کے لوگوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھ سکے، ریل کے ڈبے میں سفر کر سکے، ایک ساتھ بیٹھ کر علم حاصل کر سکے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کھیل و تفریح کے مواقع پر بھی اس قسم کی نسلی برتری اور امتیازات باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر آئے دن جھگڑے اور فسادات ہوتے رہتے ہیں، اس قسم کی باتیں اگر جاہل اور پس ماندہ اقوام میں ہوتیں تو کوئی افسوس کی بات نہ تھی، زیادہ افسوس اس بات پر ہے کہ یہ نسلی اور قومی عصبیت ان لوگوں میں ہے جو دنیا کی قیادت کا علم اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں اور خود کو انسانیت کا سب سے بڑا ہمدرد دکھتے ہیں، یہ لوگ انسانی حقوق کے تحفظ کے لئے سالانہ بڑے بڑے جلسے کرتے ہیں، جن پر لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے، لیکن سب پر ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں اس لئے کی جاتی ہیں کہ

۴۔ جاہلیت کی تمام رسموں اور باپ دادا پر فخر کو اللہ نے تم سے مٹا دیا، انسان یا خدا سے ڈرنے والا مومن ہوتا ہے یا اس کا نافرمان شقی، لوگو! تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور وہ مٹی سے بنے تھے۔

۵۔ جرم کرنے والا خود اپنے جرم کا ذمہ دار ہے، باپ کے جرم کا بیٹا اور بیٹے کے جرم کا باپ ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہے۔

۶۔ تمھارا امیر اگر کوئی نکٹا حبشی غلام ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو۔

۷۔ میں تمھارے لئے ایک چیز چھوڑ رہا ہوں، اگر تم نے اس کو مضبوطی سے پکڑے رکھا تو گمراہ نہ ہوگے، وہ چیز کیا ہے؟ وہ اللہ کی کتاب ہے۔

۸۔ تمھارے غلام! جو خود کھاتے ہو وہی ان کو کھلایا کرو، اور جو خود پہنتے ہو وہی اُن کو پہنایا کرو۔

جس زمانے میں آپ نے یہ خطبہ دیا ذرا اُس کے ماحول کا تصور کیجیے۔ آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ پیغمبر اسلام کے ارشادات میں اس زمانے کی تمام ان سیاسی اور سماجی خرابیوں کو دور کرنے کی تاکید کی گئی ہے جو انسانیت میں گھن کی کی طرح لگ گئی تھیں، طبقاتی نظام کو ختم کر کے پرہیزگاری کو معیارِ فضیلت آپ نے بنایا، گھریلو زندگی کے سدھارنے کا طریقہ عورتوں کے حقوق کی حفاظت کے ذریعے آپ نے بتایا۔ نظامِ حکومت قائم رکھنے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ ضروری تھی یعنی امیر کی اطاعت، اس کی تاکید آپ نے کی۔ رنگ و نسل وغیرہ کے وہ امتیازات جن میں کہ دنیا آج تک اُلجھی ہوئی ہے، اس سے انسانیت

مختلف ہوتی تھی، اونچے طبقے کے انسان کو معمولی سزا دی جاتی اور اُسی جرم کی پاداش میں نیچے طبقے کے شخص کو سخت سے سخت سزا دی جاتی تھی، طبقاتی تقسیم کے اعتبار سے قریب قریب یہی حال ہندوستان اور ایران کا بھی تھا، اس طبقاتی تقسیم کے ساتھ ساتھ عورتیں دوہرے عذاب میں مبتلا تھیں، ایران اور دوسرے ملکوں کو جانے دیجئے، خود ملک عرب میں پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت عورتوں کے ساتھ جو جو ظالمانہ برتاؤ کئے جاتے تھے اُن کو سن کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی مدنی زندگی کے دس سال میں ایسا مؤثر طریق کار اختیار کیا جس سے سارے ملک عرب کی کایا پلٹ ہوگئی۔ لیکن جو صرف عربوں کا نہیں بلکہ انسانوں کا نبی بنا کر بھیجا گیا تھا، وہ اپنی تعلیمات و ہدایات اور خصوصاً اپنے آخری خطبے میں جس کو خطبۂ حجۃ الوداع کہا جاتا ہے کیوں کر عام انسانوں کے نفع کو نظر انداز کر دیتا، اس خطبے کے ایک ایک لفظ سے انسانی ہمدردی ٹپکتی ہے، جس میں سے صرف چند باتیں کہ جن کا تعلق مساوات کے موضوع سے ہے نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ لوگو! بیشک تمھارا پروردگار ایک ہے، تم سب ایک باپ کی اولاد ہو، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر، کسی سرخ کو کالے پر اور کسی کالے کو سُرخ پر کوئی فضیلت نہیں، مگر پرہیز گاری کے سبب سے۔

۲۔ عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرا کرو، دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق اور ذمہ داریاں ہیں۔

۳۔ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اپنے فرائض کو بہتر طریقے سے انجام دوں تو میری مدد کرو، اور اگر اس میں کوتاہی کروں تو مجھے سیدھا کر دو "

آج دنیا کے کسی والی اور حاکم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ لوگوں سے اس قسم کے الفاظ کہے، ہر حال میں اسلام نے عدل وانصاف کا حکم دیا ہے، کسی لحاظ سے بھی بڑا آدمی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ چھوٹوں کو بُری طرح سے دبالے اور ان پر ظلم وزیادتی روا رکھے۔ عدالت کی کرسی کے سامنے سب ایک ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی تحریر فرماتے ہیں۔

" فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوحین کو جانوروں سے کچھ ہی زیادہ سمجھا، ہندو آرین ہندوستان میں آئے تو یہاں کے اصلی باشندوں کو اس طرح خاک میں ملا دیا کہ اُن کو شودر کے لقب سے خود عار نہیں رہا، رومن نے تمام مفتوحہ قوموں کو گویا غلام بنا رکھا تھا، دنیا اسی حالت میں تھی کہ اسلام کا قدم آیا۔ اس کے گردو پیش ہر طرف اس قسم کی مثالیں موجود تھیں، لیکن اس نے کیا کیا؟ یہ کیا کہ دنیا کے اس رواج یافتہ قاعدے کو دفعتہً مٹا دیا، اور قول وفعل دونوں سے بتا دیا کہ حقوقِ عامّہ میں جس قدر آدمی آسمان کے نیچے ہیں، سب برابر ہیں، اسلام ہی نے یہ بات سکھائی تھی کہ جب ایک یہودی نے حضرت علیؓ پر خود ان کی خلافت کے زمانے میں ایک زرہ کا دعویٰ کیا تو جنابِ ممدوح کو اس کی جواب دہی کے لئے عدالت میں حاضر ہونا پڑا، اور وہ بغیر کسی معمولی عذر کے فریقِ مقدمہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوئے۔ یہ اسلام ہی کی تعلیم تھی کہ جب ایک عیسائی نے ہشام بن عبدالملک

کی گلو خلاصی کی تدبیر آپ نے بتائی اور سب سے پہلے خود عمل کرکے دکھایا، ایران، ہندوستان، یورپ کے مختلف ملکوں اور خود ملک عرب میں غلامی کی جو بدترین رسم رسم پھیلی ہوئی تھی اس کے ختم کرنے کے لئے سب سے پہلا عملی قدم آپ نے اٹھایا۔

اسلامی قانون اور مساوات

دنیا ترقی کے منازل طے کرکے کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے، لیکن آج بھی بہت سی متمدن حکومتوں میں یہ قانون ہے کہ صدرِ حکومت قانونی گرفت سے بالاتر ہے۔ مذہبِ اسلام میں پیغمبر بھی اپنے آپ کو قانونی گرفت سے مستثنیٰ نہیں سمجھتا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں منبر پر جلوہ افروز ہوکر جو الفاظ فرمائے ان کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ آپ کی ذات سے اگر کسی کو تکلیف پہنچی ہو تو وہ بڑی خوشی سے بدلہ لے سکتا ہے۔ اس قسم کے مواقع پر لوگ عام طور سے مروّت برتتے ہیں اور جو بات اُن کے دلوں میں ہوتی ہے زبان پر نہیں لاتے، صحابہ کرامؓ کے دلوں میں آپ کی جو محبّت وعظمت تھی اُس کے ہوتے ہوئے کس کو لب کشائی کی جرأت ہوسکتی تھی، لیکن موقع کی نزاکت کا پورا پورا احساس کرتے ہوئے آپ نے فرمایا، سب سے زیادہ محبوب شخص میرے نزدیک وہ ہوگا جو اپنے جائز حق کا مجھ سے مطالبہ کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنے پروردگار سے پاک و صاف ہوکر ملوں۔ آپ کی حُسنِ تربیت کی یہی جھلک صحابۂ کرام میں موجود تھی، آپ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے اور لوگوں سے فرمایا۔

"مجھے تمھارا حاکم بنایا گیا ہے، حالانکہ میں سب سے اچھا نہیں ہوں، اگر میں

علامہ اقبال نے موجودہ جمہوری نظام کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

اس راز کو ایک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے (اقبالؒ)

اسلام اپنے قوانین کی پابندی کرانے میں امیر و غریب، حاکم و محکوم سب کا ایک درجہ دیتا اور کسی کو مستثنیٰ نہیں کرتا۔ دنیا کی کسی حکومت نے جب کبھی اپنے قانون کی پابندی کرانے میں کسی قسم کی جانبداری روا رکھی ہے تو اُس کے نتائج حاکم اور محکوم کسی کے لئے اچھے نہیں نکلے، اور رعایا کے لوگ دو طبقوں میں بٹ گئے۔ خوش حال اور با اثر لوگوں کا طبقہ جس کی پشت پناہی حکومت کرتی ہے، اور جو اپنے آپ کو قانونی گرفت سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ دوسرا وہ مفلوک الحال طبقہ جو حکومت کے قانون کا تختۂ مشق ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دولت اور قانون کی ایسی غیر منصفانہ تقسیم و تفریق انسانوں کو بہت سی سماجی اور اخلاقی خرابیوں میں مبتلا کر دیتی ہے، طرح طرح کے جرائم میں اضافہ ہو جاتا ہے، غربت و افلاس کے مارے ہوئے انسان تنگدستی اور فاقہ کشی کے مقابلے کی تاب نہ لا کر وہ کرنے لگتے ہیں جس کے کرنے کو ان کا ضمیر گوارا نہیں کرتا، اور عیش پرست اپنی دولت و جاہ کے نشے میں چور ہو کر اپنے ہی جیسے انسانوں کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں جس سے انسانیت شرماتی ہے۔ یہی کیفیت اسپین کی اُس وقت تھی جب وہ قیصرانِ روما کے زیر اقتدار تھا۔ ہالینڈ کے مشہور مورّخ ڈوزی

پر جو بڑی عظمت اور اقتدار کا خلیفہ گزرا ہے ایک جائداد کا دعویٰ کیا، اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا، تو حضرت عمرؒ نے ہشام کو عدالت میں طلب کیا، اور کہا کہ مدعی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دہی کرو، ہشام نے وکیل مقرر کرنا چاہا، حضرت عمرؒ نے کہا نہیں تم خود سامنے کھڑے ہو کر جواب دو، ہشام نے عیسائی کے ساتھ سخت کلامی شروع کی، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے نہایت سختی سے ڈانٹا، اور کہا کہ دوبارہ یہ حرکت سرزد ہوئی تو بغیر سزا دیئے نہ چھوڑوں گا، چونکہ روداد سے عیسائی کا حق ثابت تھا، اس کو ڈگری دلائی اور حکم دیا کہ ہشام کی دستاویز جو اُس نے پیش کی تھی چاک کر دی جائے[1]"

اسلامی مساوات اور اس کے جمہوری نظام حکومت پر ذیل کی عبارت سے روشنی پڑتی ہے۔

"اسلامی سیاست کی بنیاد مذہب کے ساتھ رکھی گئی، پیغمبر اسلام کے زمانے ہی میں آباد دنیا کے سروں تک اسلام کی دعوت بھیجی گئی، اور اسی زمانے میں ملّت کا وہ تصوّر قائم ہوا جس نے ذات، قوم اور نسل کے فرق کو مٹایا، ہر مسلمان کو براہ راست شرع یعنی دینی قانون کے ماتحت کر دیا، اور امتیازی حقوق کو رد کر کے مساوات اور بھائی چارے پر سیاسی انتظامات کی عمارت کھڑی کی۔ اس دینی مساوات کی سیاست میں ترجمانی کی گئی، ملّت کو حکومت اور حکمت عملی کے تمام معاملات میں پورا اختیار دیا گیا کہ اپنے حاکموں کو چُنے، ان کے طرزِ عمل کو جانچے، اور ان کو ہر وقت اپنی رائے اور خواہش سے آگاہ کرتی رہے[2]"

---

[1] مقالات شبلی صفحہ ۲۰۴-۲۰۵ [2] دنیا کی کہانی صفحہ ۱۲۴-۱۲۵ (پروفیسر محمد مجیب)

تنوع کے باوجود اسلام نے حقِ معیشت کو سب کے لئے برابر رکھا ہے، وہ یہ گوارا نہیں کرتا کہ اسلامی حدود میں ایک شخص بھی محروم المعیشت رہ جائے۔

اسلامی اصولِ معاشیات پر تفصیلی بحث کرنے اور قرآن و حدیث کے مستند حوالوں کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی "اسلام کا اقتصادی نظام" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"درجاتِ معیشت میں فطری حد تک تفاوت کے باوجود حقِ معیشت میں تمام کائناتِ انسانی مساوی اور برابر کی شریک ہے، اور کسی صاحب ثروت کی دولت و ثروت غریبوں کی غربت میں اضافے کے لئے نہیں ہے، بلکہ خدا کی وہ امانت ہے جو اجتماعی نظام کے زیر فرمان غرباء و مساکین کی غربت و مسکنت کو فنا کرنے کے لئے استعمال ہونی چاہیئے۔ گویا صاحب ثروت کی ثروت غرباء کی غربت کے لئے رحمت ثابت ہو نہ کہ زحمت۔

"اور اگر اربابِ ثروت ایسے عادل سسٹم کو منظور نہ کریں اور اس پر عمل پیرا نہ ہوں تو پھر خدا کے نائب (خلیفہ) کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے "اجتماعی معاشی نظام" کے مطابق اربابِ ثروت کو قانوناً اس پر مجبور کرے، اور اگر بیت المال کا مالیہ کافی نہ ہو اور اس سے بھی قلمروِ خلافت میں محروم المعیشت انسان موجود رہ جائیں تو اہلِ دولت کے سرمائے سے بہ جبر حاصل کرکے "حقِ معیشت کی مساوات" کو برروئے کار لائے۔ خواہ وہ اہلِ دولت اپنے مال میں سے تمام عائد شدہ مالی "فرائض و حقوق" ادا کر چکے ہوں[1]۔"

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام صفحہ ۸۴-۹۴

(Dozy) نے اپنی کتاب "اسپینش اسلام" میں لکھا ہے۔

"اسپین میں ایک طرف بڑی بڑی جائدادوں اور جاگیروں کے مالک، اور دوسری طرف بڑی تعداد میں شہروں کے وہ مفلس لوگ تھے جو غلاموں سے زیادہ وقعت نہ رکھتے تھے، گورنر، مجسٹریٹ، حاکم اور تمام دولت مند ہر قسم کے محصول سے سرکاری طور پر مستثنیٰ تھے، اور محصولات کا سارا بوجھ غریب باشندوں پر ڈال دیا گیا تھا، دولت مند لوگ، سرکاری حکام، خطاب یافتہ، رئیس اور جاگیردار، پرتکلف اور شاندار محلوں میں داد عیش دیتے تھے، غریب رعایا کے بدنصیب افراد غلاموں کی حیثیت سے اُن کے وسیع دسترخوانوں کو مزے دار کھانوں اور پرانی شرابوں سے آراستہ کرتے، امیر مسندوں پر تکئے لگائے اینڈتے، اور مزے اُڑاتے تھے، سامنے مطربوں کے طائفے اور قبول صورت ناچنے اور گانے والیاں اپنے فنّی کمالات سے ان کا دل خوش کرتیں، ملک کے خاص لوگوں میں دولت کی یہ فراوانی رعایا کی اکثریت کی فلاکت و مسکنت کو اور زیادہ نمایاں کرتی تھی۔"[1]

ڈوزی کی کتاب کی مذکورہ بالا سطریں پڑھنے کے بعد اسلام پر سرمایہ داری کی حمایت کا الزام لگانے والے اگر قرآن کریم، احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہؓ میں بیان کئے ہوئے اصول معاشیات کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کریں تو ان پر یہ پورے طور پر واضح ہو جائے گا کہ امارت و غربت کے فطری

---

[1] اسپینش اسلام صفحہ ۲۱۵-۲۱۶

Spanish Islam By Dozy P. 215-216

یہ ثابت کردو کہ میری فوج کے کسی شخص کا یہ فعل امن کے بعد اور دیدہ و دانستہ تھا تو میں تم کو اختیار دیتا ہوں کہ تم میری بھی ایک آنکھ پھوڑ ڈالو۔ یہ سن کر سب لوگ شانتی کے ساتھ واپس چلے گئے۔[1]"

اسلامی عبادات، نماز، روزہ، زکاۃ، اور حج بھی مساوات کا سبق سکھاتی ہیں، مسجد میں پہنچنے کے بعد شاہ و گدا، امیر و غریب، حاکم و محکوم، نسل و رنگ وغیرہ کی تفریق مٹ جاتی ہے، ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا مزدور بھی بڑے سے بڑے دولت مند کے شانے سے شانہ ملا کر کھڑا ہوتا ہے۔ حکم دیا گیا ہے کہ نماز پڑھنے والے دور دور نہ کھڑے ہوں صفیں سیدھی اور بھری ہوئی ہوں۔ اسلام میں امیروں اور غریبوں کی مسجدیں الگ نہیں، فقہ اسلامی کی رو سے وہ عبادت گاہ مسجد کا حکم نہیں رکھتی جس کو کوئی دولت مند اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے مخصوص کر دے، اور عام مسلمانوں کو اس میں نماز پڑھنے کی اجازت نہ ہو، اس قسم کی تفریق روا رکھنا اسلامی اخوت کو فنا کر دینے کے برابر ہے۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز   قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز   نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے   (اقبالؒ)

یہی حال روزے کا بھی ہے کہ اس میں کسی شخص کو اس کے جاہ و مرتبہ یا دولت مند ہونے کی وجہ سے مراعات نہیں دی گئیں، غریب کو تو کبھی کبھی تنگدستی

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد ۳ صفحہ ۲۵۲

اسلام میں "حق معیشت میں مساوات" کو اجمالی طور پر صرف لفظ "مساوات" کی مناسبت سے ذکر کردیا گیا ہے، ورنہ یہ اس کا محل و موقع نہ تھا، یہ ایک مستقل موضوع ہے، یہ چند باتیں تو جملۂ معترضہ کے طور پر آگئی ہیں، ذکر اس بات کا تھا کہ اسلام اپنا قانون منوانے میں پوری پوری مساوات برتتا اور غریب وامیر کی تفریق پسند نہیں کرتا۔

غسان کا عیسائی فرماں روا جبلہ بن ایہم اسلام قبول کرنے کے بعد حج کے لئے مکہ آیا، کعبے کا طواف کررہا تھا کہ اتفاقاً اُس کے دوشالے کے کونے پر کسی غریب بدو کا پاؤں پڑ گیا، جبلہ کو بہت زیادہ غصہ آیا، اور اُس نے بدو کے منہ پر اس زور سے گھونسا مارا کہ جس سے اُس کی آنکھ پر سخت چوٹ آئی اور بینائی جاتی رہی، اس واقعہ کی خبر حضرت عمرؓ کو ہوئی، جبلہ کو بلاکر آپ نے فرمایا کہ بدو کی آنکھ کے بدلے میں تمھاری آنکھ پھوڑی جائے گی، یہ سن کر غسانی فرمانروا کے ہوش وحواس جاتے رہے، اور کہنے لگا کہ "کیا اس بدو کی آنکھ میری آنکھ کے برابر ہے؟" باقاعدہ جوابدہی کے لئے جبلہ نے کچھ مہلت طلب کی، اور رات کو موقع پاکر اسلامی علاقے سے بھاگ کر رومیوں کے علاقے میں پہنچ گیا، اور دوبارہ عیسائی ہوگیا۔

حضرت عمر فاروقؓ اگر غریب و امیر کے فرق کو روا رکھتے تو قیامت تک کے لئے ایک بُری مثال قائم ہو جاتی۔

"جب اسلامی لشکر نے اسکندریہ فتح کیا تو مفتوح رعایا نے استغاثہ کیا کہ ان کے ایک بت کی آنکھ کسی مسلمان نے توڑ دی ہے، فوجی افسر نے کہا کہ اگر تم

زکاۃ لینے والا بھی اس طریقے کو کچھ اچھا نہیں سمجھتا، اسلام نے اس کے جذبات کا بھی پورا خیال رکھا ہے۔

قرآن کریم نے تو مالِ فَیٔ کے حصّہ داروں کو بیان کرتے ہوئے اس تقسیم کی یہ مصلحت بتائی ہے۔

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ (الحشر)	کہیں وہ (مالِ فَیٔ) تمھارے تونگروں کے قبضے میں نہ آجائے (بیان القرآن)

جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ سب غنائم اور محاصلِ جنگ بڑے لوگ کھا جایا کرتے تھے، اور فقراء محروم رہتے تھے، مالِ فَیٔ کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے اسی لئے رسول کی رائے پر رکھی اور مصارف بھی بتا دئے کہ آپ باوجود مالک ہونے کے اس مال کو اہلِ حاجت اور دیگر دینی مصالح پر صرف فرمائیں گے۔

زکاۃ کی فرضیت میں بھی یہی مصلحت ہے کہ دولت مند لوگ پورے طور پر یہ محسوس کرنے لگیں کہ جو مال و دولت وہ کماتے ہیں اس میں دوسرے انسان بھی حصّہ دار ہیں، "انفرادی ملکیت" کے باوجود ان لوگوں کو یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ جس قدر زیادہ کمائیں گے اُسی قدر اُن کی کمائی ہوئی دولت پر اجتماعی حقوق عائد ہوں گے، وہ صرف اپنے لئے ہی نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے لئے بھی کماتے ہیں، کیونکہ حقِ معیشت میں سب مساوی ہیں، یہ اور بات ہے کہ محنت کرنے والے اور کمانے والے کو زیادہ ملے، اور نہ کمانے والے کو کم۔

اسلام میں عبادات اور اخلاق کا باہمی تعلق کیا ہے؟ اس کو آئندہ صفحات میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کیا جائے گا، اس موقع پر تاریخ د

کی وجہ سے بھی فاقہ کرنا پڑتا ہے، لیکن امیر سے کہا گیا کہ وہ دولت و ثروت رکھتے ہوئے بھی اللہ کے حکم کی تعمیل میں بھوکا اور پیاسا رہے، تاکہ وہ بھی اس کا اندازہ کر سکے کہ بھوک و پیاس کیسی ہوتی ہے۔ کھانے پینے کا بہت کچھ سامان ہوتے ہوئے بھی اس کو کھانے کی اجازت نہیں۔ اسلامی حج کو دیکھئے تو اس میں بھی مساوات کی روح کارفرما نظر آئے گی، سب ایک لباس و حلیے میں دکھائی دیں گے، مجنونانہ حرکتوں میں سب کے سب ہم آہنگ نظر آئیں گے، جو والہانہ انداز میں طواف کرتے ہوئے ہوں گے۔ اس بیخودی اور وارفتگی کے عالم میں اگر اتفاق سے کسی دولت مند کی چادر کا کونہ کسی غریب کے پاؤں کے نیچے دب جائے تو اسلام اس کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں دیتا کہ دولت مند غرور و تمکنت میں آکر اس غریب کو کوئی سزا دے یا اس کو برا بھلا کہنے لگے، ایسا کرنے والے کو اسلام عملی طور پر مساوات کا سبق سکھاتا ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں جبلہ بن ایہم کے واقعے سے معلوم ہو چکا ہے۔ زکوٰۃ تو خدا کی طرف سے دولت مندوں پر فرض کی گئی ہے، اب اگر کوئی مالدار کسی غریب کو زکوٰۃ دینا چاہے تو زکوٰۃ دیتے وقت اس کے دل میں یہ خیال ہرگز نہ آنا چاہیئے کہ وہ اس غریب پر کوئی احسان کر رہا ہے، وہ تو خدا کے حکم کی تعمیل میں دوسرے انسان کو اپنی دولت کا ایک حصّہ دے رہا ہے، اور ایک ایسے فریضے سے سبکدوشی حاصل کر رہا ہے جس کے ادا نہ کرنے کی صورت میں وہ سزا کا مستحق قرار پاتا۔ اسلام نے تاکید کی ہے کہ صدقہ و زکوٰۃ نہایت خاموشی سے دینا چاہیئے، کیونکہ لوگوں کے سامنے زکاۃ و صدقہ دینے میں صدقِ نیّت کے باقی نہ رہنے اور رعونت پیدا ہو جانے کا ڈر ہے۔ اس کے علاوہ صدقہ و

کا تھوڑا سا حصہ نکال کر بیوہ عورتوں، یتیم بچّوں اور مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کرے۔ جماعت کو تو بہت زیادہ اختیار رہے کہ اسلام نے دولت کو امانت قرار دیا ہے، اور جماعت جب چاہے اس دولت کو واپس لے سکتی ہے یا اسے نئے سرے سے تقسیم کر سکتی ہے، لیکن اگر جماعت اس اختیار سے فائدہ نہ اُٹھائے تب بھی زکاۃ سے ہزاروں کا کام بن سکتا ہے۔ اسلام نے یہ بتایا ہے کہ کم سے کم کیا ہونا چاہیے، آگے جیسی آدمی کو توفیق ہو۔ دنیا اسے دے دی گئی ہے، جو چاہے کر سکتا ہے۔"

سیاسیات کے مبصر پروفیسر محمد مجیب کی اس عبارت پر اکتفا کیا جاتا ہے جس میں انھوں نے اسلامی تعلیمات پر عموماً اور "اسلامی مساوات" پر خصوصاً بڑے مؤثر انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔

" خدا، رسول، اور الہام کی حقیقت کے سوا اسلام کی تعلیم میں باقی جو کچھ ہے وہ انصاف میں سمویا ہوا علم اور تجربہ ہے۔ اور بڑی بات یہ ہے کہ اسلام نے اس علم اور تجربے کو مذہبی رسم اور قانون کی ظاہری شکل دے دی، اپنا مطالبہ کم سے کم رکھا، اور انسان کو اپنی فطرت اور زمانے کی ضروریات کا لحاظ رکھنے کی زیادہ سے زیادہ آزادی دے دی، تاکہ رسم اور قانون کسی آئندہ زمانے کی زندگی اور اس کے فرائض کے خلاف نہ پڑ جائیں۔ گوتم بدھ اور حضرت عیسیٰؑ نے آدمی آدمی کو برابر اور ایک کو دوسرے کا بھائی ٹھہرایا تھا، لیکن ایسی کوئی رسم قائم نہیں کی جو ان کی تعلیم کو لوگوں کے دلوں میں تازہ رکھے۔ اسلام نے ایک طرف جماعت کی نماز اور دوسری طرف زکاۃ کا قاعدہ بنا کر مساوات اور بھائی چارے کو ایک رسمی اور قانونی شکل دے دی۔ اگر غریب، امیر، دیسی پردیسی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کے سامنے مل جل کر کھڑے ہوں اور اپنی مسجد میں پریم کے دیئے سے اُجالا کریں لیکن اگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھر گئے ہوں، جیسے کہ آج کل ہندوستان میں، تو یہ کیا کم ہے کہ وہ کبھی کبھی ایسی جگہ پر مل جائیں جہاں ان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، اور وہ سب خدا کے بندے ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی زکاۃ بھی باہمی امداد اور بھائی چارے کی ایک آسان صورت ہے کہ ہر شخص جس کے پاس سرمایہ ہو اپنی دولت

ان کی اصلاح کرنا تھی، جیسا کہ قرآن کریم نے بتایا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ٥	وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں، اور ان کو پاک کرتے ہیں، اور ان کو کتاب اور دانش مندی سکھاتے ہیں، اور یہ لوگ پہلے سے کھلی گمراہی میں تھے۔
(الجمعۃ)	(بیان القرآن)

اوپر لکھی ہوئی آیت میں دو لفظ قابلِ غور ہیں تزکیہ اور حکمۃ، تزکیہ کے معنی ہیں پاک و صاف کرنا، اور میل کچیل دور کر کے کسی چیز کو نکھارنا، دوسری جگہ قرآن کریم میں یہی لفظ اسی مطلب کو ادا کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے، سورۃ الشمس میں ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ٥ (ترجمہ) جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا، اور جس نے اس کو مٹی میں ملایا وہ ناکام ہوا۔" قرآن کریم نے تعلیم کے ساتھ ساتھ تزکیہ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بتایا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ آپ کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ آپ لوگوں کو ہر قسم کی اخلاقی اور سماجی برائیوں سے پاک کر کے ان کے دلوں میں روشنی پیدا کریں۔ دوسرا لفظ حکمت ہے جس سے مراد وہ صحیح علم و عرفان ہے جو کسی نبی کو بخشا جاتا ہے، اور جس کے آثار رسول کی زبان سے دینی احکام اور اخلاقی تعلیمات کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ قرآن شریف میں سورۃ لقمان میں کہا گیا ہے "ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا

اسلام میں عبادات و اخلاق کا باہمی تعلق

قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبوی دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مذہب اسلام میں ایمان اور اخلاق ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا، جو شخص خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہو وہ اخلاقی قدروں سے انکار نہیں کر سکتا، اسلام نے تو دوسرے انسانوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے کو بھی عبادات بتایا ہے۔

اسلام میں اخلاق کا مرتبہ

جس طرح کہ عبادات دینی تعلیمات کی ایک اہم شاخ ہے اسی طرح اخلاق بھی، بلکہ تمام عبادات کی روح اور مقصد اصلاح اخلاق ہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی بڑی غرض اخلاقی تعلیمات کا لوگوں تک پہنچانا اور

دوسرے انسان پر رحم کرتا ہے تو گویا اس نے رحم کی صفت لفظ رحیم سے اخذ کی،
اسی لئے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر صفت رحم پیدا
کریں، حالانکہ وہ رحم جو کہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے، اور اس رحم میں کہ جو ایک
انسان دوسرے پر کرتا ہے بہت فرق ہے، جس طرح اللہ کے علم اور بندے کے علم
میں کوئی مناسبت نہیں، مگر مجازی طور پر بندے کے علم کو بھی علم کہتے ہیں جیسے کہ
اللہ کے علم کو علم کہا جاتا ہے۔ یہی حال حلیم، غفور، کریم وغیرہ اکثر صفات کا ہے۔
الغرض بندے کے تمام کاموں میں صرف اخلاق کی یہ شان ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ
کی اکثر صفات کی قائم مقامی کرتا ہے۔ یہ شان کسی دوسرے عمل کی نہیں ہے، اور
اسی لئے اخلاق کو انسان کے دوسرے تمام کاموں کے مقابلے میں امتیاز و
برتری حاصل ہے۔

عبادات اور اخلاق

یوں تو لوگوں نے نماز، روزہ، حج، زکاۃ، غرض تمام عبادات کی حکمتیں
بیان کی ہیں، مثلاً نماز کے متعلق کہا کہ اس سے اعضائے جسم کی ورزش ہو جاتی ہے،
اور روزہ رکھنے سے سال میں ایک مرتبہ معدے کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اسی
طرح حج اور زکاۃ کے متعلق بہت سی باتیں کہی گئی ہیں، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و
حدیث نے تمام عبادات یا ان میں سے کچھ کی کیا حکمتیں بتائی ہیں۔ نماز کے متعلق قرآن
کریم کے صاف الفاظ موجود ہیں اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (بیشک
نماز فحش اور خراب باتوں سے روکتی ہے) یعنی نماز کا اثر نمازی پر یہ ہونا چاہیئے کہ

کرو۔" اس کے بعد حکمت کی باتوں کو تفصیل سے بتایا گیا ہے، اور ان تمام کا تعلق عقائد، عبادات اور اخلاقیات سے ہے۔ لفظ حکمت کی اجمالی تشریح پہلے بھی آچکی ہے۔

اخلاق کی اہمیت

مذہب اسلام میں اخلاق کی اہمیت عبادات سے کہیں زیادہ ہے، اس لئے کہ عبادت "حقوق اللہ" یعنی فرائض کا نام ہے، لیکن اخلاق کا تعلق حقوق العباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات سے ہے، اگر ایک انسان دوسرے انسان کے حقوق یا ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے جن کا ادا کرنا اس کے لئے ضروری ہے تو اس تقصیر کی معافی اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں نہیں رکھی بلکہ ان بندوں کے ہاتھ میں رکھی ہے جن کے حق میں زیادتی و ظلم ہوا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو اتنی آسانی سے معاف نہیں کرتا جتنی آسانی سے اللہ تعالیٰ بڑے سے بڑے جرم اور خطا کو بشرطیکہ شرک نہ ہو معاف کر دیتے ہیں۔ اخلاقی تعلیمات کے اہم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اخلاق میں بندہ اللہ تعالیٰ کی قائم مقامی کرتا ہے۔ یعنی اخلاق دراصل خدائی صفات ہیں، اور انسان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بندگی کی حیثیت کے مطابق وہ صفات اپنے اندر پیدا کرے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ والے اخلاق کو اپنے اخلاق بناؤ؛ مثال کے طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت رحیم ہونا ہے، جب کوئی انسان

آسودہ خاطر دیکھنا چاہتا ہے۔ اور ایسے شخص کا اخلاقی معیار یقیناً بلند ہوگا لیکن وہ شخص کیا کرے کہ جو مال ہی نہ رکھتا ہو؟ پیغمبر اسلام نے فرمایا۔ اگر تم کسی شخص سے ہنس کر بات کرو (خوش خلقی سے پیش آؤ) تو یہ بھی صدقہ کرنے کے برابر ہے، اور اگر کسی کو بھلائی کا راستہ بتاؤ اور بری بات سے روکو، تو یہ بھی صدقہ کا حکم رکھتا ہے، اور ایسی جگہ جا کر کہ جہاں لوگ گمراہی میں مبتلا ہیں کسی شخص کو سچائی کا راستہ بتانا بھی صدقہ سے کم ثواب نہیں رکھتا، اور تمھارا راستے سے کانٹا وغیرہ ہٹا دینا، اپنے بھائی کے ڈول میں پانی بھر دینا، کسی اندھے یا کمزور نگاہ والے کی مدد کرنا، صدقہ کرنے کے برابر ہے۔ یہ ہے اسلام میں اخلاق کا مرتبہ۔ اگر صدقہ کرنا عبادت ہے اور یقیناً عبادت ہے تو پھر یہ تمام کام کہ جن کا تعلق اجتماعی زندگی اور انسانی اخلاق سے ہے، عبادات میں شمار ہوں گے، اور اُن کے کرنے سے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ صدقہ اور زکاۃ دینے سے ملتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام انسانوں کے لئے رحمت عالم بن کر آئے تھے، ان غریب انسانوں کو کہ جو روپیہ پیسہ، مال و دولت کچھ نہ رکھتے ہوں کیسے بھول جاتے، انسان کی اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے اور اس کو سنوارنے کا کوئی اس سے بہتر طریقہ ممکن نہ تھا جو اسلام نے اختیار کیا۔ عالمی حکومت قائم کرنے اور تمام دنیا کے انسانوں کو ایک برادری کی لڑی میں پرونے کا تخیل جو آج کل سیاست دانوں کے دماغوں میں چکر لگا رہا ہے، اور اس لئے چکر لگا رہا ہے کہ آپس کے جھگڑوں کے ختم کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ سمجھ ہی میں نہیں آتا جو ساڑھے تیرہ سو برس پہلے پیغمبر اسلام نے پیش کیا تھا۔

وہ بُری باتوں سے بچنے اور نفرت کرنے لگے۔ عرفِ عام میں نمازی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو پابندی سے نماز پڑھتا ہو۔ کبھی کبھی نماز پڑھنے والے کو کوئی نمازی نہیں کہتا، اب اگر کسی شخص کی نماز اُس کو برائیوں سے نہ روکے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس شخص نے صحیح طور پر نماز نہیں پڑھی اور اس کی نماز، نماز کہلانے کی مستحق نہیں، اگرچہ بظاہر اس نے وہ تمام کام کیے جو ایک نماز پڑھنے والا کرتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے کوئی ایسی خرابی رہ گئی کہ جس کی وجہ سے نماز نے اپنا اثر نہیں دکھایا۔ مثلاً ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ ایک گلاس پانی میں اگر ایک چمچی خالص نمک ڈال دیا جائے تو اس گلاس کا پانی بہت نمکین ہوجائے گا۔ اگر کسی شخص نے گلاس میں ایک چمچی نمک ڈالا اور پانی نمکین نہیں ہوا یا ہوا لیکن بہت کم، تو یہی خیال پیدا ہوگا کہ نمک میں کسی چیز کی ملاوٹ تھی، ورنہ جو بات بارہا تجربے میں آچکی ہے وہ کیسے غلط ہوسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نمک ڈالنے والا شخص جس چیز کو خالص نمک سمجھ رہا تھا وہ ملاوٹ سے خالی نہ تھی، اسی لئے صحیح نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ صدقہ اور زکاۃ کے متعلق قرآن میں کہا گیا خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا (التوبہ) (اُن کے مال میں سے صدقہ لے کر آپ اُن کو پاک وصاف بنا دیجئے) صدقہ اور زکاۃ انسان کے دل کو پاکیزگی بخشتے ہیں۔ مال کی محبّت بہت سے قلبی امراض انسان میں پیدا کردیتی ہے۔ حسد، طمع، غرور، نخوت جیسے امراض مال سے محبّت رکھنے کا ادنیٰ کرشمہ ہیں، لیکن زکاۃ اور صدقہ دینے والا شخص اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کو مال سے زیادہ محبّت نہیں ہے، وہ صرف اپنے ہی کو نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی خوش حال

لگاؤ ہے، حج ابراہیم خلیل اللہؑ کی خدا کے ساتھ سچی عبدیّت اور فدائیت کی ایک مشابہت پیدا کرتا ہے، اور اپنے ظاہر و باطن کو ابراہیمی رنگ میں رنگنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے، لیکن قرآن کریم کا مقصد حج جیسی عبادت سے اس سے زیادہ گہرا اور بلند تر ہے، اور وہ اخلاقِ انسانی کی تربیت ہے جس وقت سے انسان حج کے لئے گھر سے نکلتا ہے، اور جب تک واپس آتا ہے اُس کو جن دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے ان میں قدم قدم پر انسانی ہمدردی اور صبر و شکر، رحم و کرم، ایثار و قربانی، عزم و استقلال کی آزمائش ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حج کے اعلان کے لئے جو حکم دیا تھا وہ یہ ہے۔

وَاِذْ بَوَّأْنَا لِاِبْرَاهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ○ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ	اور جبکہ ہم نے ابراہیم کو جگہ خانۂ کعبہ کی بتا دی، کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک مت کرنا، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام و رکوع و سجود کرنے والوں کے واسطے پاک و صاف رکھنا، اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو، لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے، پیادہ بھی اور دُبلی اونٹنیوں پر سوار بھی، جو کہ دُور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں، اور تاکہ ایام مقررہ میں ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں، جو خدا تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں، سو ان جانوروں میں سے

روزے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ انسان بھوکا پیاسا رہے، اور نہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان اگر سال میں ایک مرتبہ مہینہ بھر تک روزہ رکھے گا تو اس کی صحت اچھی ہو جائے گی اور معدے کی حالت بہتر ہو جائے گی، اس قسم کے فوائد بھی اگر روزہ رکھنے سے حاصل ہو جائیں تو اچھا ہے، لیکن روزہ رکھنے کی اصل غرض یہ ہے کہ انسان اپنی اخلاقی حالت درست کرے، حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے روزے کی ضرورت نہیں کہ جس میں انسان کھانا پینا چھوڑ کر جھوٹ بولے اور دوسری لغویات میں حصہ لیتا رہے۔ کیا صرف جھوٹ سے پرہیز کرنا بہت سی نیکیوں کی جڑ نہیں ہے؟ قرآن کریم میں بھی صاف صاف کہہ دیا گیا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ٥ (جیسے کہ تم لوگوں پر روزہ فرض کیا گیا ہے تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض تھا تاکہ تم برائیوں سے بچو) اس آیت نے ہم کو بتا دیا کہ برائیوں سے بچنا تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرنا روزے کی اصل غرض ہے۔ جن باتوں سے سماج اور اجتماعی زندگی کو نقصان پہنچتا ہو وہ سب کی سب بری ہیں، اور جن سے سماج کو فائدہ پہنچے، وہ اخلاقیات کا قیمتی جزو ہیں، یہ ہے روزے کا اصلی فلسفہ، لوگوں کا خیال ہے کہ حج صرف مقاماتِ مقدسہ کی زیارت اور مخصوص ارکان ادا کرنے کا نام ہے، یہ خیال اس حد تک تو درست ہے کہ فرض ادا ہو جاتا ہے، اور حج کرنے والا واپسی کے بعد حاجی کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے آپ کی اُمت کو جو ایک خاص

اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے، اور جس طرح عبادات کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو عذاب سے ڈرایا گیا ہے، اسی طرح بداخلاق لوگوں کو بھی عذاب جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ اسلام میں ایمان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ہوتی ہے۔

بارہویں صدی ہجری کے امام حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اجتماعی اخلاق کو سدھارنے اور ان کی اصلاح کے لئے دوسرے تمام فضائل کو چھوڑ کر جس فضیلت کو چُنا وہ "عدل" ہے، فرماتے ہیں: "عدالت ہی ایک ایسی اساس ہے کہ جب اطوارِ زندگی مثلاً نشست و برخاست، خواب و بیداری، رفتار و گفتار، اور شکل و لباس وغیرہ میں اس کا لحاظ کیا جائے تو اسی کو "ادب" کہتے ہیں۔ اور جب مالی حیثیت یعنی جمع و خرچ سے متعلق امور میں اس کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا نام "کفایت" ہے۔ اور اگر تدبیر منزل میں اس کا صحیح استعمال کیا جائے تو وہ "آزادی" (سِوِل لبرٹی) کہلاتی ہے۔ اور اگر تدبیر مملکت میں اس کو بنیاد بنا دیا جائے تو اسی کو "سیاست" کہا جاتا ہے۔ اگر اس کو باہمی اخوت و محبت اور تعلقات میں اساس بنایا جائے تو اسی "عدل" کو حسنِ معاشرت کا نام دیا جاتا ہے[1]۔" شاہ صاحب کے نزدیک "عدالت" ایک ایسی صفت کا نام ہے کہ جب وہ کسی انسان کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ان تمام کاموں کو کہ جن کا تعلق مخلوق اور خالق سے ہو، یا اپنے ہی جیسی دوسری مخلوقات سے ہو، اس خوش اسلوبی سے انجام دیتا ہے کہ اس کے نتیجے کے طور پر وہ ایک ایسے راستے پر پڑ جاتا ہے جس کو "صراطِ مستقیم" (سیدھا راستہ) کہا گیا ہے اور جو کہ رضائے الٰہی کا منشاء ہے، ذرا غور کرنے سے

---

[1] الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر) صفحہ ۳۳۳ - (مقالہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی)

مِّنۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ (الحج)	تم بھی کھایا کرو اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو، پھر لوگوں کو چاہیئے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور اس مامون گھر کا طواف کریں۔ (بیان القرآن)

اس حکم کے ذریعے نفع سے جہاں آخرت کا نفع یعنی ثواب اور رضائے حق مراد ہے، دنیاوی نفع کو جو کہ تجارت کے ذریعے یا اخلاقی تربیت سے کہ جو مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے جلنے سے حاصل ہوتا ہے نظر انداز نہیں کیا گیا، کسی اور سفر سے خواہ کتنی ہی دور و دراز سے لوگ اس میں جمع ہوتے ہوں، اور وہ کسی مقصد کے لیئے کیوں نہ کیا جائے، یہ غرض حاصل نہیں ہوتی، پھر ان لوگوں کے لیئے بھی جو کہ مکہ اور اطراف مکہ کے رہنے والے ہیں، اور جن کو سفر کرنا نہیں پڑتا، حج میں اخلاقی اور سماجی تربیت کا سامان موجود ہے، مقامی ہونے کی وجہ سے ان پر بہت سے فرائض اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، باہر سے آنے والوں کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آئیں، اُن کو آرام پہنچانے کی پوری کوشش کریں، اُن کے جان و مال عزت و آبرو کی حفاظت کریں، یہ تمام باتیں اخلاقیات ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی اور عبادت میں انسانی تعاون کی اس قدر ضرورت نہیں پڑتی جتنی کہ حج میں پڑتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن و حدیث میں جس طرح نماز، روزہ اور دوسری عبادات کی تاکید کی گئی ہے اسی طرح اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے پر بھی زور دیا گیا ہے، بلکہ قرآن کریم کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ

اصلاح ہوتی رہے، اور عبادات کے سب سے بڑے مقصد یعنی اصلاحِ اخلاق پر بھی زور دیا۔ انسانوں کو صحیح معنی میں انسان بنا دینا اور ایسا اجتماعی نظام پیدا کر دینا کہ لوگ دماغی سکون کے ساتھ اپنے دینی اور دنیوی فرائض ادا کرتے رہیں، ہمیشہ ہمیشہ پیغمبروں کے پیش نظر ہوتا ہے۔

معاشی اور اقتصادی زندگی کا اخلاق پر اثر

معاشی اور اقتصادی زندگی لوگوں کے اخلاق پر یقیناً اثر انداز ہوتی ہے، اسی لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ضرورت محسوس کرنے پر سب سے پہلے فاسد معاشی اور اقتصادی نظام کو بدلنے کی فکر کرتے ہیں، شاہ ولی اللہؒ نے حجتہ اللہ البالغہ میں ایران اور روم کی حکومتوں کی اخلاقی اور معاشی نظام کی خرابیوں کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے۔

"آخر میں جب اس مصیبت نے بھیانک شکل اختیار کر لی، اور مرض ناقابلِ علاج حد تک پہنچ گیا تو خدائے تعالیٰ کا غضب بھڑک اٹھا، اور اس کی غیرت نے تقاضہ کیا کہ اس ہلاک مرض کا ایسا علاج کیا جائے کہ فاسد مادہ جڑ سے اکھڑ جائے اور اس کا قلع قمع ہو جائے۔ اس نے ایک نبی امّی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث کیا اور اپنا پیغامبر بنا کر بھیجا، وہ آیا اور اس نے روم و فارس کی اُن تمام رسوم کو فنا کر دیا اور عجم و روم کے رسم و رواج کے خلاف صحیح اصولوں پر ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی، اس نظام میں فارس و روم کے فاسد نظام کی قباحت کو اس طرح ظاہر کیا کہ معاشی زندگی کے اُن تمام اسباب کو یک قلم حرام کر دیا جو عوام اور جمہور پر

اندازہ ہوجائے گا کہ "عدل" کی یہ تعریف انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے کو شامل ہے۔ قرآن کریم میں جہاں احسان کرنے اور اعزہ و اقربا کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں "عدل" کو سب سے مقدم اسی لئے رکھا گیا ہے کہ یہ اجتماعی زندگی کی جان اور اصل الاصول ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۝	بیشک اللہ تعالیٰ عدل اور احسان اور اہلِ قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں، اور کھلی ہوئی برائی اور مطلق برائی اور ظلم سے منع فرماتے ہیں (اللہ تعالیٰ تم کو اس لئے نصیحت فرماتے ہیں) کہ تم نصیحت قبول کرو۔

مذکورہ بالا آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں خواہ وہ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی، یہ سمجھ کر عدل کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے ورنہ دنیاوی مصالح کا نام لے کر پھر بہت سی ایسی باتیں بھی کی جائیں گی کہ جو انسان کو دیانت و امانت کے راستے سے ہٹا دیں گی، انسان اپنی تاویلات سے اُن کو بھی عدل ہی کہتا رہے گا، جس سے اجتماعی زندگی میں فساد پیدا ہو جائے گا، اور یہی حال تمام اخلاقی تعلیمات کا ہے، اگر ان پر یہ سمجھ کر عمل کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے تو وہ پورے طور پر مُثمر و مفید ہوتی ہیں، ورنہ ظاہرداری و رسم و رواج بن کر رہ جاتی ہیں، اور اُن سے اجتماعی زندگی کو اتنا نفع نہیں پہنچتا جتنا کہ پہنچنا چاہیئے تھا، بلکہ بعض اوقات بالکل نفع نہیں پہنچتا۔ اسی لئے پیغمبروں نے جہاں لوگوں کو عبادات کے طریقے بتائے ساتھ ہی ساتھ ان کو وہ باتیں بھی بتائیں کہ جن کی وجہ سے اجتماعی زندگی کی

حدیث میں آیا ہے اَکْمَلُ الْمُؤمِنِیْنَ اِیْمَانًا اَحْسَنُھُمْ خُلُقًا۔ (ترجمہ) مسلمانوں میں کامل ایمان اُس شخص کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب اسلام میں حسن اخلاق کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہوسکتی۔ ایمان اور اخلاق ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ (میں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں) یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اُس طرز معاشرت کو پسند نہیں کیا جس میں ایک انسان دوسرے انسان سے الگ رہے، خواہ اس الگ تھلگ رہنے کی غرض عبادت ہی کیوں نہ ہو جس کو "رہبانیت" کہا جاتا ہے، کیونکہ اس قسم کی زندگی سے انسان کے پیدا کرنے کی بڑی غرض یعنی افادہ واستفادہ فوت ہوجاتی ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں "اسلامی تعلیمات دینی تعلیمات تک محدود ہیں، اور دنیوی معاملات میں انسان کی کوئی رہبری نہیں کرتیں" وہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی اس عبارت پر غور کریں، جو "معاشی اور اقتصادی زندگی کا اخلاق پر اثر" کے زیر عنوان حوالے کے طور پر نقل کی گئی ہے اور جس میں اُنھوں نے اسلام کی اُن تعلیمات کا ذکر کیا ہے جن پر عمل کرنے کا حکم اقتصادی اور معاشی نظام کے سدھارنے کی غرض سے دیا گیا ہے۔

یہاں یہ شبہ پیدا ہوسکتا ہے کہ اسلام نے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے، مردوں کو ریشمی کپڑے پہننے اور لوگوں کو عالی شان کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے سے کیوں روکا؟ یہ باتیں تو خالص دنیوی ہیں، اور اسلام تو دینی

معاشی دستبرد کا سبب بنتے، اور مختلف عیش پسندیوں کی راہیں کھول کر حیاتِ دنیوی میں بیجا انہماک کا باعث ہوتے ہیں، مثلاً مردوں کے لئے سونے چاندی کے زیورات اور حریر و دیبا کے نازک کپڑوں کا استعمال، اور تمام انسانی نفوس کے لئے خواہ مرد ہوں یا عورت ہر قسم کے چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال، اور عالیشان کوشکوں اور رفیع الشان محلات و قصور کی تعمیر اور مکانوں میں فضول زیبائش و نمائش وغیرہ، کہ یہی فاسد نظام کے ابتدائی منازل اور معاشی نظام کی تباہی کا منشاء و مولد ہیں[1]۔"

سیّد امیر علی نے لکھا ہے: "اسلام کے اخلاقی اصول کا جوہر سورہ البقرہ کی اس آیت میں موجود ہے[2]"۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝	یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں، راہ بتانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو، وہ خدا سے ڈرنے والے ایسے لوگ ہیں کہ یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے، اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری جا چکی ہیں، اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں۔ (بیان القرآن)

[1] الفرقان، شاہ ولی اللہ نمبر صفحہ ۳۴۳ - ۳۴۴ (مقالہ مولانا حفظ الرحمٰن) [2] دی اسپرٹ آف اسلام ص ۱۳۸

ان کا ضمیر گوارا نہیں کرتا۔ معاشی تباہی کے ساتھ اخلاق کی تباہی لازمی ہے، خصوصاً ان لوگوں میں جو کہ اعلیٰ قدروں کے قائل نہ ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دوربین نگاہوں نے بہت جلد اس بات کا اندازہ کرلیا کہ روم اور فارس کی حکومتوں کی تباہی کا اصل سبب اُن کے معاشی نظام کا فساد ہے، جو اخلاقی تباہی کا سبب بن جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ نے ان تمام باتوں سے روکا کہ جو بظاہر ایک اونچی زندگی کا معیار سمجھی جاتی تھیں، لیکن درحقیقت وہ سماج کے لیئے نقصان دہ تھیں، اور جب بھی دولت کی عادلانہ تقسیم نہ ہوگی معاشی اور اخلاقی فساد ضرور پیدا ہو جائے گا، کل کی بات ہے کہ جو قومیں سونے اور دولت کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا کرتی تھیں وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی ہیں کہ اب حالات کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو سینے سے الگ کر دیا جائے۔ اور دوسروں کو بھی اس سے مستفید ہونے کا موقع دیا جائے۔

اجتماعی زندگی میں اخلاقی تربیت کا مقام

کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، لیکن یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اجتماعی زندگی" اخلاقی تربیت اور اخلاقی قدروں کی اہمیت تسلیم کئے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی، صرف قدروں کا تسلیم کرنا بھی کافی نہیں، بلکہ اصلاحِ اخلاق کی طرف عملی قدم بڑھانا ضروری ہے۔ اخلاقی حس انسان کی فطرت میں موجود ہے، اور مذہب اُس کے حدود بتاتا ہے کہ کس موقع پر کس درجہ کا اخلاق برتا جائے، تاکہ نفسانی خواہشات اور خود غرضی اخلاق کے اس فطری تقاضے کو نہ دبا لیں۔ سماج کا کام یہ ہے کہ

امور میں رہبری کے لئے آیا ہے نہ کہ اس قسم کی باتوں کے بتانے کے لئے جس کا جی چاہے تانبے اور پیتل کے برتن میں کھائے اور جو چاہے چاندی اور سونے کے برتن استعمال کرے، جو شخص چاہے موٹا کپڑا پہنے، اور جو پہن سکتا ہو وہ ریشمی کپڑے پہنے، جس کو استطاعت ہو محل اور عالی شان مکان میں رہے، اور جو اتنی گنجائش نہ رکھتا ہو وہ کچے مکان یا جھونپڑے میں زندگی کے دن پورے کرے۔

اعتراض بظاہر معقول معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو رہنے سہنے، کھانے پینے اور اوڑھنے پہننے کے معاملات میں پوری آزادی ہونا چاہیئے، مذہب کو ان باتوں سے کیا سروکار؟

اسلام ایک مکمل ترین نظام ہے، اس لئے وہ ہر اس بات پر پابندی لگا دیتا ہے جس سے سماج میں خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہو۔ دنیا کی کسی حکومت میں اگر حکمراں یا کسی خاص طبقے کے لوگوں کا معیار زندگی اتنا اونچا ہو جائے کہ وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے لگیں، ریشمی کپڑے پہننے لگیں، اور سجی ہوئی عالی شان کوٹھیوں میں رہنے لگیں تو یہ لوگ حکمراں یا پشتینی دولت مند ہونے کی وجہ سے شاید اس معیار زندگی کو تھوڑے عرصے تک نباہ لے جائیں لیکن ان حکمرانوں یا پشتینی دولت مندوں کے دوست، رشتہ دار اور دوسرے لوگ کیا یہ نہ چاہیں گے کہ ان کا معیار زندگی بھی اتنا ہی بلند ہو جائے، جس کا لازمی نتیجہ، جیسا کہ شاہ صاحب نے لکھا ہے، ظلم و ستم اور دوسری بداخلاقیوں کی صورت میں ظاہر ہوگا، ظالم و جابر اور تعیش پسند حکمرانوں، جاگیرداروں اور ان کے ہم نشینوں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے لوگوں کو وہ باتیں کرنا پڑیں گی جن کے کرنے کو

ہستی کا پایا جانا یقیناً ضروری ہے جو ان پر عمل کرنے کو ہمارے لئے لازمی قرار دے، لیکن یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ کون سے کام اخلاقی اعتبار سے بہتر ہیں، اس کا پایا جانا ضروری نہیں، ہم اس ہستی کے بغیر بھی اخلاقی قدروں کو پہچان سکتے ہیں، مگر یہ کہنا کہ ان پر عمل کرنا لازمی ہے، کسی بالاتر ہستی کے موجود ہوئے بغیر بالکل بے معنی ہے۔ لوگوں کا یہ خیال درست ہے کہ کسی حاکم مطلق کا قائل نہ ہونا اخلاقی قوانین کو بے اثر بنا دے گا، کیونکہ ایسی صورت میں (اُن پر عمل کرانے کے لئے) نہ کوئی محرّک ہوگا، اور نہ سزا و انعام ہی کا قانون ہوگا، اخلاقی قوانین کو کارگر بنانے کے لئے خدا کے موجود ہونے کا خیال ضروری ہے[1]"

اسلام ایک ایسا سماج بنانے میں بڑی حد تک کامیاب رہا جس کی بنیاد ایک دوسرے کی مدد پر ہو، نظامِ زکاۃ، میراث، وقف اور ہبہ وغیرہ سب کا تعلق امداد باہمی سے ہے۔ اسی طرح صدقہ، احسان اور کسی کمزور کی حمایت کا تعلق بھی تعاون سے ہے۔ اسلام نے ان تمام کاموں کو صرف انسانی ضمیر پر نہیں چھوڑا، بلکہ یہ ضروری قرار دیا کہ وہ اپنے اخلاق کی تربیت خدا اور رسول کی بتائی ہوئی باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر کرے، تاکہ کسی وقت عقل کے فریب اور نفس کے دھوکے میں نہ آجائے، اور اگر بشریّت کے تقاضے سے کبھی لغزش ہو جائے تو بہت جلد توبہ و استغفار کے ذریعے اس کی تلافی کرلے، اسلام نے انسانی ضمیر

---

[1] لیکچرس اون اتھکس صفحہ ۴۰ Lectures on Ethics by Immanuel Kant Translated from the German P. 40.

اُن اخلاقی قوانین کی حفاظت کرے، اور اگر کوئی فرد ان کے خلاف کرے تو اس کو روکنے کی پوری کوشش کرے۔ اجتماعی زندگی میں ایک انسان کو دوسرے انسان کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے، اور اخلاقی تربیت ہی اِس شعور کو بیدار کر سکتی ہے کہ کس موقع پر کس شخص کی مدد کی جائے، صرف حکومتی قوانین اخلاقی شعور کو بیدار کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے، اور نہ تنہا اخلاقی شعور کافی ہے۔ بلکہ وہ اخلاقی شعور کہ جس کے پیچھے ایک بالاتر ہستی کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہو، تاکہ انسان محض سماج کے خوف سے اخلاق نہ برتے، بلکہ وہ یہ سمجھ کر دوسرے لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے اور ان کی مدد کرے کہ کوئی انسان مجھ کو دیکھے یا نہ دیکھے، میری تعریف کرے یا نہ کرے، میرا فرض ہے کہ میں دوسروں کی مدد کروں، میرے پیدا کرنے والے نے مجھ کو اس قابل بنایا ہے کہ میں اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی تکلیف اپنی عقل اور مال کے ذریعے سے دور کر سکوں۔ اگر میں نے کسی انسان کو تباہ و برباد ہونے دیا، یا کسی کو مجھ سے کوئی دکھ پہنچا تو میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجرم ٹھہروں گا جس کی سزا مجھ کو دی جائے گی۔ اگر حکومتوں کے قوانین انسانوں کے اخلاقی شعور کو بیدار کرنے کے لئے کافی ہوتے اور لوگوں کی اخلاقی اصلاح کر سکتے تو آج وہ حکومتیں کہ جو دنیوی ترقی اور حکومتی نظم و نسق کے لحاظ سے بڑی معیاری سمجھی جاتی ہیں، اخلاقیات کے میدان میں بھی معیاری سمجھی جاتیں۔

اٹھارھویں صدی کے جرمن فلسفی کانٹ (Kant) اپنے ایک لیکچر میں کہتے ہیں۔

" اخلاقی اعتبار سے جو چیزیں اچھی ہیں ان کی انجام دہی کے لئے ایک ایسی

زیادہ وسیع ہے، کیونکہ سب کی پیدائش کا اصلی سبب آدم علیہ السلام ہیں، اس لئے ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ بلا امتیاز رنگ ونسل اور مذہب وملت رحم وکرم، اخلاص ومحبت اور مروّت وخوش خُلقی سے پیش آنا چاہیئے، اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیئے۔ اسلام میں اخلاقی تربیت کا یہ پہلا زینہ ہے کہ جس میں انسانیت کے رشتے کو اُجاگر کیا گیا ہے، یہ ایک بڑا مشکل کام معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص سے جان پہچان ہو یا نہ ہو، ہم اس کے ساتھ اخلاق و محبّت سے پیش آئیں، اور بلا وجہ مختلف قسم کی ذمہ داریاں محض انسان ہونے کے رشتے سے اپنے اوپر لے لیں، البتہ عزیز واقارب، دوست واحباب کی حد تک کوئی مضائقہ نہیں۔ مذکورہ بالا قرآنی مضمون پر اگر غور کیا جائے تو بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے کہ رشتہ وقرابت کے لحاظ سے کسی انسان کو غیر سمجھا جائے تو اور بات ہے، لیکن درحقیقت وہ غیر نہیں ہے۔ یہ انسانی سمجھ کا پھیر ہے، اسی غیریّت کو ختم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے "مِنۡ نَّفۡسٍ وَّاحِدَۃٍ" فرمایا، اور انسان کی اجتماعی زندگی کو وسیع تر کر دیا، تاکہ اتفاقات اور حوادث کی وجہ سے جس انسان کا کوئی رشتہ دار اس دنیا میں باقی نہ رہا ہو تو وہ ہر انسان کو اپنا عزیز سمجھے، اور دوسرے انسان اس کو اپنا سمجھ کر عزیزوں جیسا برتاؤ اس کے ساتھ کریں۔

اسلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ انسان اپنے دل کو بُرے خیالات اور شیطانی وسوسوں سے پاک وصاف رکھے، تاکہ اچھی باتوں کے قبول کرنے اور اُن پر عمل کرنے میں اُس کو کوئی دشواری پیش نہ آئے، اچھے اور پاک دل والا انسان دوسروں کے لئے ضرور اچھا ہوگا، ورنہ اس کو اچھے دل کا انسان

کو بیدار کرنے اور اچھی عادتوں کو طبیعتِ انسانی میں پختہ کرنے کے بہت سے مفید اور کار آمد طریقے بتلائے، اور یہ اس لئے کہ جب افراد بہتر ہو جائیں گے تو اجتماعی زندگی یقیناً بہتر ہوتی چلی جائے گی۔

ایک بہتر سماج بنانے کے لئے اسلام نے یہ بتایا کہ کوئی انسان خواہ وہ رُوئے زمین کے کسی خطّے کا رہنے والا کیوں نہ ہو، دوسرے انسان سے محض انسانیت کے رشتے سے اس کا کچھ نہ کچھ لگاؤ ہے، اور دونوں ایک دوسرے کی محبّت اور رحم و کرم کے مستحق ہیں، کیونکہ پیدا کرنے والے نے اُن کو جس ڈھب سے پیدا کیا ہے اُس کا ایک منشا۔ یہ بھی ہے کہ اُس کی زمین پر بسنے والے تمام انسان سکونُ چین کی زندگی بسر کریں۔

قرآن کریم میں ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا ۝	اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا، اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں، اور تم خدا تعالیٰ سے ڈرو جس کے نام سے ایک دوسرے سے مطالبہ کیا کرتے ہو، اور قرابت سے بھی ڈرو، بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔
(النساء)	(بیان القرآن)

خالقِ انسان نے بہت صاف طور پر یہ بتا دیا کہ انسانی برادری کا حلقہ بہت

اس میں موجود ہی کیوں نہ ہو، غیبت کرنا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے، جس طرح مردہ اپنے جسم کی حفاظت نہیں کرسکتا، اسی طرح وہ شخص بھی جس کی برائی پیٹھ پیچھے کی جارہی ہے، اپنے الزام کی مدافعت نہیں کرسکتا، غیبت کو ایک بہت گھناؤنی بات سے تشبیہہ دے کر اس کو ایک اخلاقی جرم اس لئے قرار دیا کہ اس سے کسی کی اصلاح نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات وہ شخص جس کی کہ برائی کی جاتی ہے اور زیادہ ضدّی ہوجاتا ہے اور اس برائی کو نہیں چھوڑتا۔

یہ ہمارا روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ غیبت سے سماج میں کس قدر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور نئے نئے جھگڑے خاندانوں میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جن کو ختم کرنے میں کافی دقّتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور وقت الگ برباد ہوتا ہے، یہی وقت کسی اور تعمیری کام میں صرف کیا جاسکتا تھا، آج کل یہ برائی ان لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے جو بزعمِ خود ہر اعتبار سے اپنا معیارِ زندگی دوسروں سے بلند سمجھتے ہیں۔ دوسروں کے عیوب تلاش کرنے سے بھی اسی لئے روکا گیا ہے کہ یہ بھی معاشرے میں خرابیاں پیدا کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔

یہ بھی ایک فطری چیز ہے کہ جس شخص کی غیبت کی جاتی، یا اس کو نقصان پہنچانے کی کوئی تدبیر کی جاتی ہے، تو معلوم ہونے پر اس کو سخت غصّہ آتا ہے اور کسی نہ کسی طرح سے بدلہ لینے کے لئے تیار ہوجاتا ہے، اب اگر یہ شخص بدلہ لیتا ہے تو یقیناً فساد بڑھے گا، فساد کو روکنے کے لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایسے مواقع پر قصور معاف کردینے اور درگزر کرنے کی ترغیب دی ہے، اور یہ قرآنی قانون صرف غیبت کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر اس تکلیف کے لئے ہے جو ایک انسان

ہی کہنا صحیح نہ ہوگا۔

قرآن کریم میں ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى (الاعلیٰ)	بلاشبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک و صاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی

پیغمبر اسلام نے بہترین انسان اس کو کہا جس کے اخلاق اچھے ہوں۔

خِيَارُكُمْ اَحْسَنُكُمْ اَخْلَاقًا (بخاری)	تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ہر وہ چیز جو سماجی زندگی میں خرابی اور نفرت پیدا کرنے والی ہو، اس سے بچنے اور دور رہنے کا حکم اسلام نے سختی سے دیا ہے۔

قرآن کریم میں ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۭ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ۝ (الحجرات)	اے ایمان والو بہت سے گمانوں سے بچا کرو کیونکہ بعضے گمان گناہ ہوتے ہیں، اور سراغ مت لگایا کرو، اور کوئی کسی کی غیبت بھی نہ کیا کرے، کیا تم میں کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھالے، اس کو تو تم ناگوار سمجھتے ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (بیان القرآن)

کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنے کو غیبت کہتے ہیں، خواہ وہ برائی اور عیب

بَیْنَکَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ج وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ ۝ (حم سجدہ)	تمھارے درمیان دشمنی ہے، وہ ایسا ہو جائیگا جیسا ناتے دار دوست، اور یہ بات انہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جن کی بڑی قسمت ہے۔

کیا اس قسم کے اخلاق و عادات والے لوگ ایک بہترین سماج نہ بنائیں گے؟ جو لوگ ایک اچھا سماج بنا سکتے، یا بناتے ہیں وہ یقیناً خوش نصیب اور خدا کے نزدیک اچھے بدلے کے مستحق ہوں گے۔

ضمیر[1] کی بیداری محرکاتِ اخلاق کا اہم عنصر ہے

اخلاقی تعلیمات میں اسلام نے دینی منافع کے ساتھ ساتھ دنیوی منافع کو بھی نظرانداز نہیں کیا ہے، جیسا کہ بہت سی حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے، ہدیہ بھیجنے اور سلام کرنے کی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی کہ اس سے باہمی محبت پیدا ہوتی ہے۔ تجربہ ہے کہ جس محبت کی بنا رخلوص پر ہوتی ہے، اُس سے ایک انسان دوسرے انسان سے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ تعاون کے بہت سے راستے کھل جاتے ہیں اور انسانیت کو فائدہ پہنچتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلۂ رحمی کا ثمرہ یہ بتایا کہ اس سے روزی میں

---

[1] ضمیر اس پوشیدہ قوت کا نام ہے جو انسان کو برائیوں کے نتائج سے ڈرا کر اُن سے روکنے کی کوشش کرتی اور بھلائیوں کی ترغیب دیتی ہے، برائی کرنے کے بعد ندامت و بےچینی کا ظہور اور بھلائی کرنے کے بعد راحت و مسرت کا احساس اسی قوت کا کرشمہ ہے۔

(کتاب الاخلاق صفحہ ۶۳۔ احمد امین مصری)

سے دوسرے انسان کو پہنچے۔

قرآن کریم میں ہے۔

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ٥ (النور)	اور چاہیئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے، اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یعنی اگر تم لوگوں کے قصور سے درگزر کروگے تو اللہ تعالیٰ تمھاری خطاؤں سے بھی درگزر کرے گا، آخر تم بھی تو گناہ کرنے کے بعد ہم سے معافی ہی کی اُمید رکھتے ہو، اور بہت مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم تمھارے گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں، اب اگر تم ہی جیسا انسان تم کو کوئی تکلیف پہنچاتا ہے، تو تم کو اس کا قصور معاف کر دینا چاہیئے۔ دوسروں کے قصور تو بہت سے لوگ معاف کر دیتے ہیں، کیونکہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے وہ نرم ہوتے ہیں، لیکن یہ ایک بڑا مشکل کام ہے کہ جو ہمارے ساتھ بُرائی کرے ہم اُس کے ساتھ بھلائی کریں، اور جو ہم سے دشمنی اور فساد کی بات کرے ہم اُس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ قرآن کریم نے یہی تعلیم دی ہے، اور اُن لوگوں کو خوش نصیب کہا ہے جو اللہ کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتے ہیں، قرآن کریم نے یہ بھی بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی بہترین تدبیر ہے۔

قرآن کریم میں ہے۔

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ	نیکی اور بدی برابر نہیں، تم بُرائی کا جواب بھلائی سے دو پھر دیکھو کہ وہ جس کے اور

پڑوسی پر لعنت ملامت کرنے لگے، پڑوسی کو خبر ہوئی تو اس کے پاس آیا اور کہا کہ اپنے گھر چلو، خدا کی قسم اب میں تم کو نہ ستاؤں گا۔[1]

گناہ کرنا بیشک بُرا ہے، اور جو لوگ گناہ سرزد ہو جانے کے بعد ندامت و شرمندگی محسوس کرتے ہیں، ان کی اصلاح کی توقع باقی رہتی ہے، کیونکہ احساس گناہ ضمیر کی بیداری کا پتہ دیتا ہے، گناہ کو گناہ اور بُرائی کو برائی سمجھنے والے لوگ بسا اوقات تھوڑی سی احتیاط سے گناہ اور بُرائی سے بچ جاتے ہیں، لیکن وہ شخص کہ جس کا ضمیر گناہ کرتے کرتے مردہ ہو گیا ہو اور وہ گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھتا ہو، اس کی اصلاح بڑی مشکل ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات تو ہوتی ہی نہیں پاتی۔ پیغمبروں کی تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اکثر و بیشتر جزئیات کی تعلیم دیتے ہیں، فلسفیوں کی طرح کلیات قائم نہیں کرتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی زیادہ تر جزئیاتِ اخلاق کی تعلیم دی ہے، لیکن کبھی کبھی آپ نے ایسی جامع اخلاقی تعلیم بھی دی ہے جو اصولاً تمام اخلاقی بُرائیوں اور بھلائیوں کو شامل ہے۔

ایک صحابی نے آپ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کی تو آپ نے فرمایا۔

نیکی خوش خُلقی کا نام ہے، اور گناہ وہ ہے جو تمھارے دل میں کھٹکے اور تم کو یہ پسند نہ ہو کہ لوگ اس سے واقف ہوں۔[2]

---

[1] تاریخ اخلاق اسلامی (حصّہ اوّل) صفحہ ۳۴۲-بحوالہ ادب المفرد باب شکایتہ الجار (تالیف مولانا عبد السلام صاحب ندوی) [2] ایضاً صفحہ ۱۴۲

وسعت ہوتی اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔ کون انسان ایسا ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ اس کی عمر میں برکت اور روزی میں وسعت ہو، تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ اخلاقی تعلیمات میں انسانی نفسیات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، جس کام کا نفع دنیا ہی میں انسان کو ہوتا دکھائی دے، فطرتاً وہ اس کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کرے گا۔ جو لوگ اپنے ضرورت مند عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرتے ہیں وہ بہت سے خانگی اور خاندانی جھگڑوں سے بچے رہتے ہیں، اُن کی زندگی پُرسکون رہتی ہے، اور وہ لطفِ زندگی محسوس کرتے ہیں۔ انسان طبعاً احسان فراموش نہیں ہوتا، اس لئے عزیزوں کے ساتھ صلۂ رحمی اور اچھا سلوک کرنے کا صلہ خود اس کو یا اس کی اولاد کو اکثر مل ہی جاتا ہے، زمانہ کے انقلابات دولت و عزت کو کسی ایک انسان کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے، وہی ضرورت مند رشتہ دار، یا ان کی اولاد میں سے کوئی آگے چل کر اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے محسن یا اس کی اولاد اور متعلقین کے ساتھ اچھا سلوک کر سکے، اور اس طرح سے انسانی معاشرے کا معیار بلند تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

"بعض موقعوں پر دنیوی بدنامی کو بھی محرک اخلاق قرار دیا ہے، مثلاً ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں شکایت کی کہ میرا پڑوسی مجھکو ستاتا ہے، آپ نے فرمایا کہ جاؤ اپنے گھر کا سامان نکال کر راستے میں ڈال دو، اُس نے گھر کا تمام سامان راستے میں ڈال دیا تو لوگوں کا ہجوم ہو گیا، اور سب کے سب اس واقعے کا سبب پوچھنے لگے، اس نے سبب بتایا تو سیاس کے

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مُصنّف	سنہ طباعت
	اُردو		
۱	الدین القیم	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	۱۹۴۸ء
۲	اسلامی معاشیات	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	۱۹۴۸ء
۳	الفاروق	شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی	•
۴	اسلام کا اقتصادی نظام	مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب	۱۹۴۶ء (طبع ثالث)
۵	اسلام اور موجودہ مدنی مسائل	مولانا محمد عبد الرؤف صاحب	۱۹۳۷ء
۶	ابن رشد	مولانا محمد یونس صاحب فرنگی محلی	۱۳۴۲ھ
۷	الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر)	مولانا محمد منظور نعمانی صاحب (ایڈیٹر)	۱۹۴۱ء (طبع دوم)
۸	الفرقان (رسالہ)	مولانا محمد منظور نعمانی صاحب (ایڈیٹر)	نومبر ۱۹۴۹ء
۹	ترجمان السنۃ (حصۂ اول)	مولانا محمد بدر عالم صاحب	۱۹۴۸ء
۱۰	تمدنِ عرب	علامہ سید علی بلگرامی	۱۹۳۶ء
۱۱	تاریخ اسلام پر ایک نظر	مولانا عبد الرحمٰن خاں صاحب ایم اے	۱۹۵۲ء
۱۲	تعلیماتِ اسلام اور مسیحی اقوام	مولانا قاری محمد طیب صاحب	۱۳۵۶ھ

ظاہر ہے کہ جس کا ضمیر مردہ ہو چکا ہو اور وہ گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھتا ہو اس کے
دل میں کسی کام سے بھی کھٹک پیدا نہیں ہوتی۔

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نور بصیرت عام کر دے

(اقبال)

نمبر شمار	کتاب	مصنف	سنہ طباعت
	عربی		
۱	الدین	ڈاکٹر محمد عبد اللہ دراز	۱۹۵۲ء (مصر)
۲	الوحی المحمدی	سید محمد رشید رضا	۱۹۴۷ء (مصر)
۳	الفوز الکبیر (ترجمہ از فارسی)	مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۱۹۳۹ء
۴	المنقذ من الضلال	محمد بن محمد الغزالی	۰ (مصر)
۵	الاصابہ	علامہ ابن حجر عسقلانی	۱۸۷۳ء (کلکتہ)
۶	اللہ	عباس محمود عقاد	۱۹۵۴ء (مصر)
۷	التسامح فی الاسلام	الشیخ محمد احمد حسونہ	۰ (مصر)
۸	تفسیر ابن کثیر	حافظ عماد الدین (ابن کثیر)	۰ (مصر)
۹	حجۃ اللہ البالغہ	مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی	۱۳۵۲ھ (مصر)
۱۰	رسالۃ التوحید	شیخ محمد عبدہٗ	۱۳۷۳ھ (مصر)
۱۱	فتوح الشام	ابو اسماعیل محمد بن عبد اللہ الازدی	۱۸۵۴ء (کلکتہ)
۱۲	فی الفلسفۃ الاسلامیۃ	ڈاکٹر ابراہیم مدکور	۱۹۴۷ء (مصر)
۱۳	کتاب الخراج	قاضی ابو یوسفؒ	۱۳۵۲ھ (مصر)
۱۴	کتاب الاخلاق	سید احمد امین	۱۳۵۳ (مصر)
۱۵	مقدمۃ ابن خلدون	علامہ عبد الرحمٰن ابن خلدون	۰ (مصر)

نمبر شمار	کتاب	مصنف	سنہ طباعت
۱۳	تاریخ القرآن	مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی	۱۳۴۳ھ
۱۴	تذکرۂ اعظم	مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمانی	۱۳۳۲ھ
۱۵	تمدنِ اسلام کا پیام بیسویں صدی کی دنیا کے نام (مقالہ)	مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی	۱۹۴۱ء
۱۶	تدوینِ قرآن	مولانا غلام ربانی صاحب ایم اے	۱۹۵۱ء
۱۷	تدوینِ حدیث	مولانا سید مناظر احسن گیلانی	۱۳۵۹ھ
۱۸	تفسیر بیان القرآن	مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی	۱۹۳۰ء
۱۹	ترجمان القرآن	مولانا ابوالکلام صاحب آزاد	۱۹۳۱ء
۲۰	تاریخ اخلاق اسلامی (حصہ اول)	مولانا عبدالسلام صاحب ندوی	۱۹۳۹ء
۲۱	خطباتِ مدراس	مولانا سید سلیمان ندوی	۱۹۳۶ء
۲۲	دنیا کی کہانی	پروفیسر محمد مجیب صاحب	۱۹۳۸ء (طبع اول)
۲۳	رحمۃ اللعالمین	قاضی محمد سلیمان صاحب منصورپوری	۱۹۳۳ء
۲۴	سیرت النبی (جلد چہارم)	مولانا سید سلیمان ندوی	۱۹۳۵ء
۲۵	علم الکلام	شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی	
۲۶	علم الکلام	مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی	۱۳۷۰ھ
۲۷	قرآن اور تعمیر سیرت	ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب	۱۹۵۲ء
۲۸	کتابتِ حدیث	مولانا سید منت اللہ شاہ صاحب رحمانی	۱۹۵۱ء
۲۹	مقالاتِ شبلی	شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی	۱۹۵۴ء

English

S. No.	Name of the Book	Author	Year of publication
1.	A Short History of tne Saracens	Syed Ameer Ali	1951
2.	The Cultural Side of Islam	Muhammad Marmaduke Pickthall	1937
3.	The Spirit of Islam	Syed Ameer Ali	1952
4.	The Life of Mahomet (Muhammad)	Washington Irving	1946
5.	The Preaching of Islam	T. W. Arnold	1935
6.	The Arabs: A Short History	Philip K. Hitti	1950
7.	Introduction to the Science of Religion	Max Muller	1882
8.	Islam at the Cross-roads	Muhammad Asad	1941
9.	Lectures on Ethics (Four Lectures)	Immanuel Kant	1930
10.	On Heroes & Hero-worship	Carlyle	1950
11.	Spanish Islam	Dozy	1913